سیرۃ امام اعظم ابو حنیفہؒ

اتہام شیعیت کی حقیقت

مرتبہ

پروفیسر حکیم سید علی احمد عباسی ایم، ایس، سی علیگ

فاضل اسلامیات

محمود [illegible] بی ایریا۔ لیاقت آباد کراچی ۱۹

نام کتاب۔ سیرۃ امام اعظم ابو حنیفہؒ (اتہام شیعیت کی حقیقت)

نام مؤلف۔ پروفیسر حکیم سید علی احمد عباسی ایم، ایس، سی علیگ

مطبوعہ۔ مطبع سعیدی قرآن محل کراچی

سال طباعت۔ اکتوبر سنہ ۱۹۷۰ء

تعداد۔ ایک ہزار

قیمت۔ صرف تین روپے

ناشر مکتبہ محمود ۱/۲۴ بی ایریا لیاقت آباد کراچی ۱۹

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ

تعارف

حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رح کے سوانح وتذکرہ کی یہ نئی کتاب اس اعتبار سے اور بھی قابل قدر ولائق توصیف ہے کہ امام صاحب کے مدون مذہب اور سیاسی مسلک کے بارے میں جو خلاف واقعہ روایتیں اور وضعی قصے کہانیاں صدیوں سے مشہور ہیں۔ فاضل مؤلف کتاب نے تحقیق وریسرچ کے اعلیٰ معیار سے انھیں جانچا پرکھا ہے جس سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ومنکشف ہو گئی کہ یہ سارے قصے ولایعنی فضولیات اسی زہریلے پروپیگنڈے کا شاخسانہ ہیں جو اموی وعباسی خلفاء کی تنقیص اور ان علوی داعیوں کی مدح وتقدیس میں برابر ومتواتر ہوتا رہا ہے جو وقتاً فوقتاً حکومت قائمہ کے خلاف با دعائے تفاخر نسب خروج وبغاوت کر کے خائب وخاسر رہے۔ تھے اسی سلسلے میں یہ داستان سرائی بھی کی جاتی ہے کہ امام صاحب نسباً چونکہ ابناء فارس سے ہیں۔ اور مولد ومنشا بھی آپ کا شیعان علی کا مرکزی شہر کوفہ تھا جسے حضرت علی رضؓ نے اپنے مختصر سے ایام خلافت میں مدینۃ النبی کے بجائے دار الخلافہ سیاسی مصالح سے بنا لیا تھا۔ یہ واقعہ امام صاحب کی ولادت سے کوئی چالیس سال قبل کا ہے مگر کہا جاتا ہے کہ امام صاحب کے والد ثابت کو جو اس زمانے میں کم سن تھے۔ آپ کے دادا نے حضرت علیؓ کے حضور دعائے خیر وبرکت کے لئے پیش کیا تھا۔ امام صاحب کے اجداد میں انکے دادا ہی مشرف باسلام ہوئے تھے۔ حضرت نے اس فارسی بچے کو دعائے خیر دی تھی بس اسی ایک واقعہ سے جو آپ کے والد ثابت کے بچپن کا بتایا جاتا ہے۔ امام صاحب کو علوی خاندان کا اسدرجہ عقیدتمند ظاہر کیا گیا ہے کہ جب کوئی علوی وفاطمی آپ کے زمانے میں خلیفہ وقت کی اطاعت سے منہ موڑ کر جمہور جماعت سے علیحدگی اختیار کر کے شریعت کے واضح احکام کی خلاف ورزی میں خروج

بغاوت کا اقدام کر بیٹھتا۔ امام صاحب حمایت سے اس کی نہ چوکتے خفیہ خفیہ مالی امداد کیا کرتے بلکہ ایک علوی کے خروج و بغاوت کو تو کہا جاتا ہے۔ آپ نے غزوہ بدر کے معاذ اللہ مماثل قرار دے ڈالا تھا۔ لیکن اس مفروضہ غزوہ و جہاد میں بذاتِ خود شریک ہونے کی سعادت حاصل نہ کی۔ اسی ضمن میں یہ کذب بیانی بھی کی جاتی ہے کہ اموی خلافت میں تو کوڑے لگوانے کی سزا آپ کو دی گئی۔ اور عباسی خلیفہ نے عہدہ قضا پر تقرر کرنا چاہا انکار پر قید و بند کی سزا دی بعد میں زہر دیکر مروا ڈالا۔ یہ سارے واھی قصے اور وضعی روایتیں قطعاً بے بنیاد ہیں۔ فاضل مولف نے نقد و درایت سے ان خصولیات کی علمی پوری طرح کھول دی ہے اور روایتاً و درایتاً ثابت کر دکھایا ہے کہ امام صاحب کی ایذا دہی و اہانت کے بجائے عباسی خلافت میں آپکی مناسب قدر و منزلت کی گئی۔

مکہ معظمہ میں چند سال متواتر قیام کرنے کے بعد بروایت صدر الائمہ امام اعظمؒ زمانہ امیر المومنین ابو جعفر المنصور عباسیؒ کوفہ واپس آئے (ج ۱ ص ۲۴) امیر المومنین کی پہلی ملاقات کو حاضر دربار ہوئے امیر عیسیٰ بن موسیٰ عباسی نے ھٰذا اعلم الناس الیوم (آج یہ تمام دنیا میں سب سے بڑے عالم ہیں) کہکر تعارف کرایا۔ فاضل مولف کتاب نے مستند حوالہ سے بتایا ہے کہ امیر المومنین نے فرمایا۔

اے نعمان! تم نے کہاں کہاں علم فاضل کیا ہے۔ امام اعظمؒ نے جواباً کہا۔ کہ میں فاروق اعظم حضرت عمرؓ حضرت علیؓ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے علمی سرچشموں سے سیراب ہوا ہوں۔ امیر المومنین نے یہ سنکر اظہار مسرت کرتے ہوئے کہا۔ اسے نعمان! تم نے اپنا علمی رشتہ الطیبین الطاہرین المبارکین رضی اللہ عنہم اجمعین سے مضبوط قائم کیا ہے۔ پھر اہل علم کے بغایت قدردان و سرپرست خلیفہ نے جو بذاتِ خود بلند پایہ عالم و محدث تھے اور ملت اسلامیہ میں یا فضا علمی تحریک کے بانی اور جاری کرنے والے تھے۔ امام صاحب کو لعزت و احترام اپنے پاس

دینی و علمی مہمات امور کی انجام دہی ان کے سپرد کی جو امام صاحب مرتے دم تک انجام دیتے رہے۔

مودودی صاحب نے اپنی رسوائے زمانہ کتاب "خلافت و ملوکیت" ہیں جس کے چند فقرے شیعی کتابچہ نویس نے بھی درج کئے ہیں جو یہ غلط بیانی عصبیت جاہلی کے جذبہ سے کی ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے بذاتِ خود غیر سرکاری طور سے فقہ کی تدوین کی۔ اس کی مکمل تردید ہماری تالیف "حقیقت خلافت و ملوکیت" میں کی جا چکی ہے اور فاضل مؤلف نے بھی تدوین فقہ کے اس عظیم کارنامے کا زیر سرپرستی خلافت عباسیہ انجام دیا جانا اور رائج ہونا جس بیان مستند حوالوں سے پیش کیا ہے سبائی راویوں اور علوی باغیوں کے طرفداروں نے امام صاحب کے قید و بند و ہتک حرمت کی روایتیں اور قصے جو تراشے ہیں محض فضولیات ہیں۔

حضرت امام اعظمؒ کو سیاسی ہنگاموں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ دینی اور علمی ماحول میں ساری عمر بسر کی۔ احکام شریعت کی متابعت میں اور اپنے اساتذہ کرام خصوصاً حضرت عطا بن ابی رباحؒ کے مسلک و موقف کے اعتبار سے جو حضرت ابن عباسؓ کے شاگرد رشید تھے امام صاحب پوری طرح جماعت سے وابستہ رہتے اور تعلیمات نبویہ کے مطابق خلیفہ وقت کی اطاعت پر مضبوطی سے قائم رہ کر فتنہ و فساد کی تحریکوں سے محترز رہے بفحوائے آیت کریمہ اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ وَکَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْھُمْ فِیْ شَیْءٍ (جو لوگ دین میں تفرقہ پیدا کرلیں اور گروہ (شیعہ) بن بیٹھیں (اے رسول) تیرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ تفرقہ بازوں سے حضرت امام اعظمؒ بھی ایسے متنفر رہے کہ شیعہ راویوں سے جو صحابہ کی توہین کرکے علم دین کے لئے خطرہ ہیں اور تقیہ کا عقیدہ بھی انہیں اور مشکوک کردیتا ہے۔ روایت لینا جائز نہ سمجھتے تھے۔ امام عبداللہ

بن المبارک کی سند سے یہ قول آپ کا منقول ہے کہ اہل ہوا (اہل بدعت) سے روایت لی جا سکتی ہے بشرطیکہ وہ عادل ہوں۔ (الا الشیعة فان اصل عقیدتہم تضلیل اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم) لیکن شیعہ سے روایت نہ لی جائے کیونکہ ان کے عقیدے کی عمارت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی توہین تضلیل پر ہے۔ (الکفایہ فی علم الروایة) اب دیکھئے جو پیشوائے مذہب و امام اہل سنت والجماعت کسی شیعہ سے روایت قبول کرنے کے بھی روادار نہ ہوں، حضرات شیخین السیدین کی افضلیت کو مذہب اہل سنت کی پہچان بتا کر یہ فرمایا کرتے ہوں

ثم نقر ان افضل ھذا الامة اعنی خیر الامم بعد نبینا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکرؓ ثم عمرؓ ثم عثمانؓ ثم علیؓ (کتاب الوصیة امام ابوحنیفہ) یعنی پھر ہم یہ اقرار کریں کہ سب سے افضل اس امت یعنی خیر الامم میں بعد ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ابوبکرؓ ہیں پھر عمرؓ پھر عثمانؓ پھر علیؓ ان ہی پیشوا و امام اعظمؒ کو مذہباً شیعہ بنانے کو کسی شیعہ نے جو اپنے نام کے ساتھ "اجتہادی" کا دُم چھلا بھی لگاتے ہیں۔ ایک کتابچہ اس نام سے شائع کرایا ہے"

امام ابوحنیفہ شیعہ تھے۔ تاریخی انکشاف۔

مگر لطف تو یہ کہ اس "تاریخی بکواس" کی کامل و مکمل تردید و تکذیب خود ان ہی کے علماء و فضلاء سابق کی تحریرات بالخصوص شیعان ہند کے "شہید ثالث" قاضی نور اللہ شوشتری علیہ ما علیہ جیسے غالی شیعہ کی تصریحات سے ہو جاتی ہے۔

سلہ یہ شوشتری عہد اکبری میں لاہور کے قاضی تھے اور بقول شیخ علی حزین شیعی تقیہ سے سنی بنے ہوئے تھے۔ اپنی تالیفات میں جو خفیہ رکھتے۔ خصوصاً کتاب مجالس المومنین میں

جو ان کی مشہور تالیف مجالس المومنین کے صفحات میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ شوستری نے بہت سے اکابر اہل تسنن حجتہ الاسلام امام غزالیؒ شیخ سعدیؒ و مولانا رومیؒ وغیرہم کو زمرہ شیعہ میں شامل کیا ہے۔ لیکن امام اعظمؒ کے بارے میں صاف کہدیا ہے کہ "ابو حنیفہ کوفی کہ امام اعظم خواجہ سنی است (ج ۱ صفحہ ۲۸۰) نیز شہر کوفہ کے ذکر میں مزید لکھا ہے۔ کہ "ابو حنیفہ باوجود کوفی الاصل ہونے کے مذہباً شیعہ نہ تھے۔ درآنحالیکہ کوفیوں کا شیعہ مذہب ہونا تو کسی دلیل کا محتاج نہیں۔ البتہ کوفی الاصل کا سنی مذہب ہونا محتاج دلیل کا ہے"۔ "واگرچہ ابو حنیفہ کوفی باشد" (ج ۱ صفحہ ۵۶) شوشتری کے علاوہ ایک اور شیعہ مولف حسن صدر الدین نے کتاب الشیعہ وفنون اسلام میں جس کا ایک اڈیشن "شیعہ یا پدید آرندگان فنون اسلام" ہے۔ اس غلط بیانی کے ساتھ کہ شیعوں کو اسلامی علوم وفنون میں سینوں پر تقدم وتفوق ہے، علامہ سیوطی کے حوالے سے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ سب سے پہلے شخص (اور مقصود اس پہلے شخص سے اہل سنت کے شخص سے ہے) جس نے علم فقہ میں کتاب مدون کی ابو حنیفہ تھے (صفحہ ۷۹)

شیعہ کتابچہ نویس نے اتہام شیعت کے ساتھ امام اعظم ابو حنیفہؒ کو

(بقیہ صفحہ ۸) اکابر صحابہ کی سخت مذمت و بدگوئی کی ہے۔ علمائے حق کی شکایت پر جہانگیر بادشاہ کے دربار میں طلب ہوئے۔ اپنی کتاب میں ابو حنیفہ کے تذکرے بھی درج کئے ہیں۔ بادشاہ کے پیر اور روحانی باپ شیخ سلیم چشتیؒ کے بارے میں پوچھا گیا۔ اہل گرفتہ شوشتری کی زبان سے بروایت مولف "سوانح شہید ثالث" "قرم ساق سگ بود ناتحقیق" کلمات نکلتے ہی سزاء "زبان گدی سے کھنچوا کر قتل کرا دیا گیا۔ یہ واقعہ ۱۰۱۹ھ کا ہے۔

شاگرد بھی زید علی بن حسین رح کا بتا دیا ہے اور دوسروں نے شیعوں کے چھٹے امام جعفر صادق کا۔ شوشتری ہی نے اس شاگردی کی حقیقت بھی شیعی جبلت سے گستاخانہ طرزِ عبارت میں بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

شاگردی ابو حنیفہ بحضرت امام جعفر این قدر بودہ کہ از آنحضرت بعضے از احادیث شنیدہ و چون آنحضرت او را از مردودان میدانستند از و تقیہ می نمودہ اظہار مذہب حق باد نمی نمودہ (ج ا صہ ۳۶)	حضرت امام جعفرؒ سے ابو حنیفہ کی شاگردی صرف اس قدر تھی کہ ان حضرت سے کچھ حدیثیں سنی تھیں چونکہ وہ حضرت ان کو مردودوں میں سمجھتے تھے۔ ان سے تقیہ کرتے اور اظہار مذہب حق کا ان پر برتہ کرتے

فاضل مؤلف کتاب ہذا نے حضرت امام اعظم رح کے اساتذہ کرام کا تذکرہ بالتفصیل کرتے ہوئے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ جعفر صادق اور ان کے چچا زید بن علی بن حسینؓ کا کوئی تعلق امام صاحب کے اکتساب علم سے نہ تھا۔ امام اعظم رح ابو حنیفہؒ کا شمار تو صغار تابعین میں ہے۔ ۲۲ صحابہ کرام میں سے جو ان کے ابتدائے عمر میں موجود ہے آٹھ بزرگواروں سے ملاقات ثابت ہے، سالہا سال قیام مکہ معظمہ میں رہتا۔ بقول صاحب درمختار آپ نے ۵۵ حج کئے تھے، حرم کعبہ کی مسجد میں بیٹھے ہوتے تو مسائل شرعیت پوچھنے والوں کا ایسا ہجوم ہوتا تھا کہ بقول امام لیث بن سعدؒ رأیتُ النّاسَ مُتَقَصِّفِیْنَ علیہ (میں نے دیکھا کہ لوگ ان پر ٹوٹ پڑتے ہیں) یہ کیفیت اور یہ حالت کسی علوی و فاطمی بزرگ کی مجلس کی کہیں منقول نہیں۔ امام ابن حزم نے اپنی مشہور تالیف الملل والنحل (ج ۳ صہ ۳۹) یہ بیان کرتے ہوئے کہ جعفر صادق رح کی کوئی برتری و فضیلت علم میں

دین میں عمل ہیں دوسرے ہمعصر علماء محمد بن مسلم الزہری و قبیصہ بن ذویب وغیرہم پر نہ تھی۔ لکھا ہے کہ "ابن عباس رض نے اپنی فقہ بیس کتابوں میں جمع کی ہے اور اگر تلاش کی جائے تو ان کی حدیث بھی قریب قریب اسی حد تک پہونچے گی۔ حالانکہ حسن رض وحسین رض کی فقہ دو ورق تک بھی نہیں پہنچتی۔ یہی حال علی بن حسین رض (زین العابدین رح) کا بھی ہے۔ محمد بن علی (یعنی محمد باقر) کی حدیث اور فقہ ایک چھوٹے سے جزو تک پہنچتی ہے اور اسی طرح جعفر بن محمد (جعفر صادق۔م) کی بھی حالانکہ روافض کا دعوی یہ ہے کہ امام کے پاس شریعت کا کل علم ہوتا ہے۔ جعفر بن محمد کے بعد تو ہمیں ان ائمہ کے علم کا بالکل پتہ نہ چلا۔ نہ حدیث میں نہ فقہ میں باوجودیکہ ان لوگوں کا زمانہ ہمارے زمانے کے قریب ہے۔"

حضرت امام ابوحنیفہ رح بیک واسطہ حضرت ابن عباس رح کے اور دو واسطوں سے حضرت فاروق اعظم رض و حضرت علی رض و حضرت عبداللہ بن مسعود رح کے علمی سرچشموں سے سیراب ہوئے تھے۔ ہمعصر علوی حضرات سے جو ائمہ شیعہ میں شمار ہوتے ہیں۔ اکتساب علم کا مطلق تعلق نہ تھا۔ ان کی علمی شان و جلالت ان حضرات سے بہت بلند تھی۔ امام ابن المبارک نے اپنے گرامی منزلت استاد کے فیوض و برکات علمی کے بارے میں صحیح کہا ہے کہ

رَوىٰ آثارَہ فاجابَ فیھا ۔۔۔ کطیرانِ الصقورِ من المنیفۃ

انہوں نے آثار کو روایت کیا تو ایسی بلند پروازی دکھائی جیسے شکاری پرندے بلند مقام سے اڑ رہے ہوں۔

ولم یکن لہ بالعراقِ نظیر ۔۔۔ ولا بالمشرقین ولا بالکوفۃ

نہ عراق میں ان کی کوئی مثال تھی ۔۔۔ نہ مشرق و مغرب اور نہ کوفہ میں

اس لچر کتابچہ کے بدگو شیعی مولف نے حضرت امام اعظم رح کے بارے میں

یاوہ گوئی کرنے کے علاوہ حضرات خلفائے ثلاثہ یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضہ اکبر و حضرت عمر فاروق اعظم رضہ و حضرت عثمان ذوالنورین رضہ و دیگر صحابہ کرام کی جناب میں گستاخی کرتے ہوئے شرف صحابیت کی تنقیص میں جو کلمات بد لکھے ہیں یا ازواج مطہرات ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضہ و ام المومنین حضرت حفصہ رضہ جیسی ذوات عالیہ کو جو بنص قرآن وَمَن يَقْنُتْ مِنكُنَّ لِلَّهِ وَرَسُولِهِ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَا أَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ بنات طاہرات حضرت فاطمہ رضہ وغیرہا اور تمام صحابہ کرام سے افضل ہیں۔ خارج از ایمان قرار دیتے ہوئے وضعی روایت کے اشارے وکنایہ سے لکھ مارا ہے کہ "شیعہ ان ازواج رسول کو بھی خارج از ایمان سمجھتے ہیں۔ جنہوں نے حضرت ماریہ قبطیہ پر تہمت لگائی یا حضرت عثمان رضہ کو نعثل یہودی دین سے خارج اور واجب القتل کہا۔"

شیعی راویوں کی ان من گھڑت قطعی جھوٹی اور واہی روایتوں کا کوئی خفیف سا تعلق بھی حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحہ کے سوانح حیات سے نہیں ہے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دونوں اہل البیت (اہل خانہ) جن کے بارے میں کذب وافترا یہ لغو بیانی کی گئی ہے چونکہ صاحبزادیاں ہیں حضرت ابوبکر الصدیق رضہ اور حضرت عمر الفاروق رضہ جیسے عظمائے ملت جلیل القدر صحابہ کرام کی جن سے عناد و دشمنی شیعیت کی گویا اساس و بنیاد کی طرح ہے یہ بد گو شیعہ کتابچہ نویس ان امہات المومنین کی اس طرح بے موقع و بے محل تنقیص کرنے سے بھی کیوں باز رہتا بقول لیکہ ؎

نیش عقرب نہ از پے کین است ٭ مقتضائے طبیعتش این است

حضرت علی رضہ کو حضرت عمر فاروق اعظم رضہ کی ذات مستجمع الصفات سے کچھ ایسی عقیدت تھی کہ اپنی نور دیدہ سیدہ ام کلثوم بنت سیدہ فاطمہ رضہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی زوجیت میں دیا پھر اپنے ان داماد کے ایک دشمن اسلام سازشی کے ہاتھوں مقتول ہو جانے پر ان کے جنازے کے پاس کھڑے ہوئے

کس حسرت سے یہ الفاظ کہے تھے " اے کاش! میرے بھی کچھ اعمال ایسے ہی ہوتے جیسے ان صاحب جنازے کے ہیں مگر بدگوشیعی مولف نے ایک اختراعی واہی قصے کا ذکر کرتے ہوئے حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کی زبان سے جو حضرت علیؓ کے صاحبزادوں حسنؓ و حسینؓ سے سن وسال میں چودہ پندرہ برس بڑے تھے یہ لغو اور بے بنیاد بات کہلوائی ہے کہ " ایک دفعہ حسنؑ نے عبد اللہ بن عمر کو غلام زادہ کہہ دیا، انہوں نے باپ سے شکایت کی انہوں نے کہا لکھوا لاؤ، صاحبزادے نے لکھ دیا۔ وہ نوشتہ باپ کے پاس لائے تو انہوں نے کہا اس کو میرے کفن میں رکھ دینا یہ سند ہے۔ غلامی اہل بیت ضمانت جنت ہے"۔ (ص ۵۰)
کتابچہ نویس کی اس لایعنی بکواس کا مقصد نسل پرستی کے شیعی عقیدے کا اظہار ہے مگر کس واہی طور سے۔ حضرت علیؓ کا خاندان بنی ہاشم اور حضرت عمرؓ کا خاندان بنی عدی قبیلہ قریش کے دو دیگر ذیلی شاخوں میں منسلک تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی نسباً قریشی ہاشمی ہیں۔ قبیلہ قریش اور غیر قریشی عرب تفاخر نسبی میں سب سے زیادہ مبتلا تھے۔ اسلامی تعلیمات نے اس جاہلی فخر کو مٹا کر سب اہل کلمہ کو بھائی بھائی بنا دیا انما المومنون اخوۃ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عظیم خطبہ حجۃ الوداع میں امت کو مختلف نصیحتیں و وصیتیں کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ نسل و نسب کے اعتبار سے کسی عربی کو کسی عجمی پر کسی کالے رنگ والے کو کسی گورے رنگ والے پر کوئی برتری و فضیلت نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اکرم وہ ہے جو زیادہ متقی ہے۔
آپؐ نے اپنے چچا حضرت عباسؓ اپنی پھوپھی حضرت صفیہؓ اور اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کو مخاطب کرکے فرمایا تھا کہ آخرت میں ہم تمہارے کسی کام نہیں آسکتا۔ تم لوگ عمل نیک کرو وہ ہی تمہارے کام آئیں گے فانذا التفتح۔

فِی الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَیْنَھُمْ وَلَا یَتَسَآءَلُوْنَ ۵ (سورہ نور) یعنی پھر جب صور پھونکا جائے گا تو ان کے (انسانوں کے) درمیان کوئی رشتہ نہ رہے گا۔ نہ وہ ایک دوسرے سے بات پوچھیں گے۔ نیز فرمایا گیا ہے۔ لَنْ تَنْفَعَکُمْ اَرْحَامُکُمْ وَلَآ اَوْلَادُکُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یعنی تمہارے رشتے اور تمہاری اولاد قیامت کے دن ہرگز تمہیں نفع نہیں پہنچائیں گے۔ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُہٗ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ یعنی جن کا (نیکی کا) پلّہ بھاری ہوگا۔ وہ کامیاب ہونگے۔ حضرت عمر فاروق اعظمؓ سے یہ کلمہ لایعنی منسوب کرنا "غلامی اہل بیت ضمانت جنت ہے"! اس بدگوشیعی کی احمقانہ جسارت ہے۔ شیعہ تحریک حقیقتاً عجمی پیداوار ہے۔ شیعی اہل عجم کو حضرت ممدوح سے خاص عداوت تو اسی وجہ سے ہے کہ آپ ہی کے مبارک ایّام خلافت میں ایران فتح ہوکر درفش کاویانی کا پرچم ہمیشہ کے لئے سرنگوں ہوکر اسلام کا بول بالا ہوا تھا۔ ایک ایرانی شاعر ضیائے گردی ہی نے صحیح بات کہہ دی ہے۔

بشکست عمرؓ پشت ہزبران عجم را
برباد فنا داد رگ و ریشہ جم را
این عربدہ بر غصب خلافت ز علیؓ نیست
با آلِ عمرؓ کینہ قدیم است عجم را

اہل البیت سے کلام اللہ میں مراد صرف ازواج نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ہے سورۃ الاحزاب کے چوتھے رکوع میں یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ کہکر ازواج رسول اللہ ہی سے خطاب ہے ان ہی کو نصیحتیں ہیں اور ان کو رجس سے پاک کرنیکا وعدہ

ہے۔ ان ہی کو اہل البیت (اہل خانہ) فرمایا گیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی اور قرابتدار کے لئے چچا ہوں یا بیٹی یہ قرآنی لفظ استعمال کرنا تحریف معنوی کے مرادف ہے۔ بیٹی جوان ہو کر بیاہی جائے وہ اپنے شوہر کی اہلبیت ہوگی نہ کہ اپنے والد کی اہلبیت کہلا سکے گی۔

اس کتاب سیرۃ امام اعظم ابو حنیفہؒ کے فاضل مؤلف نے مورخانہ معیار تحقیق و ریسرچ سے امام صاحب کے مذہب و مسلک کے ہر پہلو کی بالوضاحت بیان کر کے ان اکاذیب و خرافات کی حقیقت عیاں کر دی ہے جو اموی و عباسی خلافت کے مخالفین نے امام صاحب کے وقائع زندگی کے سلسلے میں اپنے ذہن سے تراش تراش کر مشتہر کیں۔ شیعہ کتابچہ نویس ایک طرف تو امام اعظمؒ کو مذہباً شیعہ بتاتا ہے۔ پھر یہ بکواس بھی کرتا ہے کہ قاضی ابو یوسف نے ایک مکمل فقہ تیار کر کے اپنے استاد ابو حنیفہ کی طرف منسوب کر دیا اور فقہ حنفی وجود میں آ کر حکومت عباسیہ کا قانون بن گئی۔ اور پانچ سو برس تک اسے حکومت کی سرپرستی حاصل رہی۔ اس وجہ سے کثیر التعداد مسلمان اس کے پیرو ہو گئے ورنہ ابو حنیفہ کی نہ کوئی فقہ ہے نہ وہ کسی مدرسہ فقیہہ کے بانی تھے نہ انہیں اپنی زندگی میں کوئی ایسا امتیاز حاصل تھا۔

"قاضی ابو یوسف نے ابو حنیفہ کو امام اور مجتہد بنا دیا ورنہ کوئی انھیں جانتا بھی نہیں" صفحہ) اس متعصب شیعہ کو کیا معلوم کہ اسلام کے مشہور اماموں میں کسی کے اتنے اصحاب و شاگرد نہیں ہوئے جتنے امام ابو حنیفہؒ کے ہوئے۔ فاضل مؤلف کتاب نے چند جلیل القدر شاگردوں کے حالات بھی بیان کر دیئے ہیں۔ امام الکردری نے سات سو تیس ۷۳۰ مشاہیر علمائے کرام کے نام بقید نام و نسب لکھے ہیں جو مختلف دیار و امصار میں آپ کے شاگرد تھے۔

علامہ ابن الندیم نے اسی بہتات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔
العلم برًا و بحرًا شرقًا و غربًا بعدًا او قربًا تدوینہ رضی اللّٰہ عنہ یعنی دور و نزدیک مشرق و مغرب اور خشکی و تری میں (ابو حنیفہ) ہی کا علم پھیلا تھا (الفہرست صفحہ ۳۰) شیعوں کے کسی امام کے علمی وسعت کا ایسا کوئی تذکرہ کہیں نہیں الغرض فاضل مؤلف کی یہ کتاب حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رح کے سوانح حیات اور آپ کے گرانقدر علمی خدمات کا جو خلفائے عباسی کے ایما اور سرپرستی میں انجام دین آئینہ ہے۔ محب مکرم جناب عبدالعزیز صاحب کا نیوزی انجینیر (فردوس کالونی) اور بعض دوسرے صحیح العقیدہ مخلص صاحبان کا شکریہ واجب ہے۔ جن کے تعاون و ہمت افزائی سے یہ کتاب منظر عام پر آسکی۔

احقر

محمود احمد عباسی

کراچی

۲ ر رمضان المبارک سنہ ۱۳۹۰ھ

۳ ر نومبر سنہ ۱۹۷۰ عیسوی۔

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ محمد خیر الوریٰ وخلفائہ اعلام الہدیٰ۔ اما بعد

اہلِ پاکستان کی غالب اکثریت حنفی المذہب ہے لیکن امام اعظم ابو حنیفہ کے متعلق عہد حاضر کے جن اہل قلم نے کتابیں لکھیں، کتابچے شائع کیے اور اخباروں، رسالوں میں مضامین طبع کرائے ان میں بلا تحقیق ایسی باتیں لکھدیں جو عقلاً و نقلاً قابلِ قبول نہیں۔ یہ غلطیاں زیادہ تر تاریخی اعتبار سے ہیں۔ آپ کی شخصیت، میلانِ طبع اور مواقف اور پھر آپ کے سلسلۂ تلمذ کے بارے میں بے پا یا اور خلاف واقعہ باتیں لکھ کر بعض لوگوں نے یہاں تک ثابت کرنے کی کوشش کی کہ آپ شیعہ تھے۔ یا شیعیت کی طرف رجحان رکھتے تھے نرم سے نرم بات یہ کہی گئی ہے کہ آپ کی ہمدردیاں آلِ علی میں سے ان حضرات کے ساتھ تھیں جو وقتاً فوقتاً خلافت قائمہ کے خلاف کھڑے ہوئے۔

اس خود ساختہ نظریے کے تحت یہ بھی ثابت کرنے کی سعی لاحاصل کی گئی ہے کہ حضرت امام کے نزدیک گویا اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قائم کردہ نظام خلافت صحیح نہیں تھا۔ یعنی خلفائے اسلام کی یہ حیثیت نہ تھی کہ ان کے ساتھ تعاون کیا جائے اور شرعی بنیاد پر انھیں امام تسلیم کرکے

ان کی اطاعت کی جائے۔ حضرت امام کی طرف یہ تصور منسوب کر کے ایسی فضا قائم کی گئی ہے کہ خلفاء بھی گویا ان سے اور ان کے شاگردوں سے کھٹکتے تھے، انھیں ایذائیں دیتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ ان حضرات کے نظریات اُمت میں پھیلنے نہ پائیں۔

یہ سب باتیں خلاف واقعہ ہیں۔ اس سلسلے میں صدیوں بعد کے راویوں کی غلط بیانیوں پر تکیہ کیا گیا ہے، اور جن غیر محتاط مصنفوں نے اپنی کتابوں میں یہ بے حقیقت باتیں درج کردیں، انہی کو عہد حاضر کے لوگ اپنا ماخذ بنا کر بے سوچے سمجھے یا بالقصد ایک منصوبے کے تحت نقل در نقل کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اگر متقدموں کی کتابیں اور قریب العہد مصنفوں کی تحریروں سے بعد کے لوگوں کی روایات کا مقابلہ کرلیا جاتا، تو صحیح صورتِ حال سامنے آجاتی علاوہ ازیں یہ بھی دیکھنا تھا کہ حضرت امام مجتہد مطلق ہیں اور امت کی غالب اکثریت ان کے اجتہاد پر عمل کرتی ہے۔ اس لئے اہلِ تصنیف کی حقانیت کا تقاضا تھا کہ وہ حضرت امام کے شاگردوں اور متوسلوں کے موقف پر بھی نگاہ ڈالتے اور غور کرتے کہ جو باتیں امام صاحب کی طرف منسوب کردی گئی ہیں وہ ان کے کھلے ہوئے مُدوّن مذہب سے بھی مطابقت رکھتی ہیں یا نہیں۔

معتبر ترین ماخذ کی روشنی میں جو باتیں سامنے آتی ہیں اور امام حنیفہ کے مذہب سے بداہتاً عیاں ہیں، ان سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ امام صاحب پوری طرح جماعت سے وابستہ تھے۔ شیعیت کی ان میں رمق بھی نہ تھی، اور تعلیمات نبویہ کے مطابق وہ اجماعِ صحابہ کو حجت شرعیہ جانتے تھے جماعت اور اس کے امام سے وابستگی ان کے نزدیک فرائض ملّیہ میں تھی خلیفۂ وقت کی اطاعت اور اس کے ساتھ تعاون، ان کی زندگی کا اصول

تھا، وہ کسی درجے میں بھی امام جماعت کے خلاف خروج و بغاوت کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔

لوگوں نے فرقہ وارانہ اور نسلی جذبات کے تحت یہ تصور دلوں میں جاگزین کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہمارے ائمہ اور خلافت قائمہ کے درمیان دوئی تھی اور خلفاء کرام اپنے اپنے عہد کے علماء و فقہا پر حریفانہ نگاہ ڈالتے تھے یعنی وحدتِ امت مفقود تھی اور بجائے اس کے کہ تمام انفرادی و اجتماعی امور ملّیہ خلیفہ و امام وقت کی قیادت میں انجام پائیں۔ صورت یہ بتائی جاتی ہے کہ امت کی قیادت بٹ گئی تھی۔ علماء و فقہاء عوام کو ایک راہ لگانا چاہتے تھے اور خلفاء دوسری راہ پر۔

گویا اس طرح ایک طرف تو یہ جتایا گیا کہ امّت سیاسی معاملات سے بے نیاز ہو گئی تھی۔ اسے پرواہ نہ رہی کہ حکومتِ وقت کیسی ہے اور اس کے تقاضے کیا ہیں، اور دوسری طرف اس کی شہرت دی گئی کہ خلفاء بھی من مانی کرتے تھے۔ امّت کی فلاح و بہبود سے انہیں غرض نہ تھی، جور و استبداد پر ان کا مدار تھا۔ کیونکہ علماء و فقہاء نے یہ وتیرہ اختیار کر رکھا تھا کہ خلافت قائمہ سے عدم تعاون کریں، ان کے مناصب قبول کرنے پر تیار نہ ہوں، اور موقعہ بے موقعہ ان کی مخالفت پر ڈٹے رہیں۔

چنانچہ جو ائمۂ فقہ و حدیث امّت میں اپنا مقام رکھتے ہیں ان کی متعلق عموماً ایسی روایتوں کو شہرت دی گئی جن سے معلوم ہو کہ وہ حکومت کی اطاعت واجب نہیں جانتے تھے۔ اور حکومت بھی ان پر ظلم و ستم توڑتی رہتی تھی۔ یہ سب خیالی قصّہ محض اس لئے قائم کی گئی ہے کہ اس سیاسی نظام کی حیثیت شرعی نہ رہے جو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنا اجماع

سے قائم کیا تھا۔ اور امت اسی نظام کی خوگر ہو گئی تھی۔

پھر جن علماء و فقہا کو حکومت کے مناصب پر دیکھا اور امت میں ان کی مقبولیت پائی۔ یا تو ملت کے اندرونی دشمنوں نے ان کی علمی اور روحانی عظمت کم کرنے کے لئے انھیں خلفا کا آلۂ کار بتانے کی کوشش کی یا جب اس طرح کام چلتا نظر نہ آیا تو بیان کیا کہ خلفاء تو ان پر رعب حکومت ڈالتے تھے مگر وہ ان کا رعب مانتے نہ تھے اور ان کے سامنے کلمۂ حق کہہ کر جہاد اکبر کرتے رہتے تھے۔ یعنی ائمہ فقہ و حدیث اور خلافت قائمہ کے درمیان ہمیشہ خلفشار قائم رہا اور باہمی تعاون و احترام و یک جہتی کے ساتھ فرائض ملّیہ ادا کرنے کی سبیل نہ رہی۔

گویا جس امت کو خدا تعالیٰ نے خیر امۃ فرمایا ہے، اہل عالم کیلئے نمونہ بنایا ہے اور اسے بشارت دی ہے کہ اسے صراط مستقیم پر قائم رکھے وہ امت ان کے خیال میں آج تک شرّ امّت چلی آتی ہے۔ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے دامن سے وابستہ جماعۃ المسلمین سب کا ایک ہی حال تھا۔ یعنی وہ زمانہ جو خیر القرون کہلاتا ہے اور جو سنہ ۲۵ھ میں ختم ہوا، اسی مدت میں دین مسخ ہو گیا، امت گم راہ ہو گئی اور بقول مودودی صاحب اس کی قیادت سنہ ۴۰ھ کے بعد جاہلیت کے ہاتھ میں چلی گئی۔ اس تصوّر کے باوجود دعویٰ کیا جاتا ہے کہ دین اسلام ایک زندہ و پائندہ تحریک ہے۔ جس کا نور پورا ہو کر رہے گا۔ اگر چہ کافروں کو ناگوار ہو۔

لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آخری امت کی فطرت ہی ایسی رکھی ہے کہ یہ کبھی غلط بات پر مجتمع نہیں ہوتی۔ اور یہ ناممکن ہے کہ

کوئی غلط رو شخص اپنے "نسب و علم و تقدس" کے دام میں اسے پھنسا سکے یہ جب مجتمع ہوگی تو اس تطرئیے پر جو اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہوگا۔ اور جس میں امت کی فلاح ہوگی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ایک صدی کے اندر اندر یہ امت تین چوتھائی متمدن دنیا پر چھا گئی اور تیسری صدی کی نصف سے پہلے پہلے اہل عالم پر اپنا ذہنی اور روحانی تفوق اس طرح ثابت کر دیا کہ زندگی کے ہر نظام اور اسی کے مقرر کردہ منہاج کی پیروی کر کے دنیا کے لوگ کامیاب ہو رہے ہیں۔

چوتھی صدی ہجری جو تاریخ امت کا سیاہ ترین دور ہے اور جس میں عجمی طاقتوں نے سیاسی تفوق حاصل کر کے دین مبین کو مسخ اور دعوت محمدیہ کو فنا کرنے کی کسی سازش سے دریغ نہیں کیا، وہ اپنی کوششوں میں اسی لئے پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکے کہ مسلمانوں نے خیر القرون ہی میں اپنا دین مدوّن و محفوظ کر لیا تھا اور اپنا لائحہ عمل ایسا رکھا تھا کہ ہر تخریبی تحریک فنا کے گھاٹ اترتی رہی اور امت کی مجموعی قوت نے رہ رہ کر غلبہ حاصل کر لیا۔

تاریخ اسلام کی یہی روئداد ہے۔ اسی لئے ملت کے اندرونی دشمنوں نے عاجز آ کر تصنیف و تالیف کا سہارا لیا اور روایات واہیہ کی بھرمار سے اپنی سیاسی شکست کا بدلہ لینا چاہا۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معجزہ ہے۔ اور آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم کی کرامت کہ ایسی جتنی بھی روایتیں ہیں ان میں قدرتی تضاد پیدا ہو گیا۔ اور اس طرح ان روایات کی اندرونی و بیرونی شہادتیں ان کے بے پایہ ہونے کی منہ بولتی تصویریں بن کر ابھر آتی ہیں۔

برصغیر پاک و ہند کے مشہور عالم مناظر احسن گیلانی مرحوم جنھوں نے امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی لکھی، یا مودودی صاحب جنھوں نے حال ہی میں اپنی رسوائے زمانہ کتاب "خلافت وملوکیت" لکھ کر امت پر اور خود اپنے اوپر ظلم عظیم کیا ہے، یا مصر کے مشہور مصنف شیخ ابوزہرہ نے جنھوں نے ائمہ اربعہ پر کتابیں لکھیں، ان میں کسی نے ان ائمہ کی شخصیتوں اور ان جیسی غیر سیاسی اور علمی ہستیوں کے "سیاسی" مواقف پر تبصرہ کرتے تحقیق سے قطعاً کام نہیں لیا۔ بلکہ درایت سے منہ موڑ کر صدیوں بعد کے غیر محتاط مؤلفوں کی متضاد خرافات پر تکیہ کر کے وہ باتیں ان بزرگواروں کی طرف منسوب کر دیں جو کسی طرح تاریخی حیثیت سے ثابت نہیں کی جا سکتیں۔

مصری عالم احمد امین کا بھی اس سلسلے میں بڑا مقام ہے انھوں نے امت کے ثقافتی ارتقاء وزوال پر فجر الاسلام، ظہر الاسلام وغیرہ کتابیں لکھیں۔ ان کا مطمح نظر تو ادب تھا۔ مگر دوسری باتیں بھی آ گئیں ہیں۔ عہدِ حاضر کے ذہنی جمود بلکہ پستی کے زمانے میں شخص واحد کا اس طرح کام کرنا بہت بڑا کارنامہ ہے لیکن افسوس کہ تاریخی امور میں ان کا زیادہ انحصار الاغانی پر ہے جس میں رطب و یابس بلکہ بے پایہ روایتوں کی اتنی کثرت ہے کہ اہلِ تحقیق کے ہاں اس کی کوئی قیمت نہیں اور وقائع تاریخیہ میں اس سے بے محابا استناد کسی درجے میں درست نہیں سمجھا جا سکتا۔ صاحب کتاب اگرچہ نسباً اموی ہیں۔ لیکن شیعی المشرب آل حمدان کے دربار سے وابستگی کے سبب وہ غلط راہ پر پڑ گئے اور ایسی لغو باتیں لکھ گئے جن کی رکاکت عیاں ہے۔ اس کے باوجود احمد امین نے جگہ جگہ "الاغانی" سے استناد کیا ہے۔

عوام کو فقہی آراء اور مذہبی نکات سے اتنی دلچسپی نہیں ہوتی جتنی ائمہ کی شخصیتوں کے ذاتی اور صفاتی احوال سے۔ اس لئے ملت سنی وفاداری کا تقاضا ہے کہ ان حضرات کے بارے میں مقدور بھر تحقیق کر کے بات کہی جائے۔ تاکہ ان کے حقیقی خط وخال نمایاں ہوں۔ ہمارے پیش نظر چونکہ اس وقت صرف امام اعظم ابو حنیفہؒ کی شخصیت ہے۔ اس لئے ہم ان فضولیات اور لغویات کی تنقیح کرنا چاہتے ہیں۔ جو بے احتیاطی سے یا اپنے مفسدانہ عزائم کے تحت لوگوں نے لکھ ماری ہیں اور برابر انھیں شہرت دے رہے ہیں حتیٰ کہ امام صاحب کو شیعیت سے متہم کرنے کی لغو بیانی کی جسارت بھی کی گئی ہے۔

علی احمد عباسی
سیدو شریف سوات

شخصیت امام اعظم ابو حنیفہ رح

نام ونسب:- امام صاحب کا خاندان عجمی الاصل ہے، عرب خاندان تیم اللّات سے جو قبائل الخزرج (انصار) سے کوفہ میں مسکن گزین تھا۔ ان کا رشتہ "ولاء" تھا۔ ولاء تین معنی کے لئے مستعمل ہے ایک یہ کہ آدمی جنگی قیدی بن کر آئے اور وہ ایسا ہو کہ نہ اسے احسان رکھکر چھوڑا جاسکے اور نہ فدیہ لے کر۔ پھر دشمن اسے تبادلے میں واپس لینے پر بھی تیار نہ ہو۔ ایسے جنگی قیدیوں کو مختلف مجاہدوں کا مملوک بنا دیا جاتا تھا۔ اور ملکیت میں دیتے وقت آقا اور مملوک دونوں کی معاشرتی حیثیت کا خیال رکھا جاتا تھا۔ قانوناً یہ مملوک اپنے آقاؤں کے گھر والوں ہی کی طرح ہو جاتے تھے، ان کے کھانے پینے کا انداز حکماً وہی رکھا جاتا تھا جو گھر والوں کا ہو۔ اگر ان کا آقا انھیں آزاد کر دے تب بھی یہ اسی خاندان سے وابستہ رہتے تھے۔ اور اسی قبیلے میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ اور یہ موالی کہلاتے تھے۔ اِنَّ مَوْلیٰ القوم منهم" (ایک قوم کا مولیٰ انھیں میں ہوتا ہے) امام صاحب کے خاندانی ولاء کی یہ صورت نہ تھی۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ غیر عرب آزاد قبائل کو امیرالمؤمنین اپنی ذاتی سرپرستی میں لے لیں جیسے امیرالمؤمنین ہشامؒ نے بعض قبائلِ عجم کو یہ شرف بخشا تھا۔ اور وہ موالی امیرالمؤمنین کہلاتے تھے۔ امام صاحب کی ولاء اس معنی میں بھی نہ تھی۔

تیسرا دستور تھا کہ آزاد غیر عرب کسی عربی قبیلے میں رضا کارانہ شامل ہو جاتا تھا۔ اور وہ قبیلہ اسے اور اس کے خاندان کو قبول کر لیتا تھا۔ حضرت امام صاحب کی ولاء اسی قسم کی تھی۔ آپ کے دادا زوطی نے یہ رشتہ ولاء قبیلہ تیم اللات سے استوار کر لیا تھا۔ جن کا خاندان کوفہ میں مسکن گزین تھا۔ اس طرح ان کے حقوق وہی ہو گئے جو اس قبیلے کے تھے۔ یہ صورت عرب و عجم کا فرق مٹانے کی تھی۔

امیر المؤمنین حضرت عمر الفاروق رضؓ کے عہد مبارک میں جب دیوان مرتب ہوا، اور تمام قبائل کے سرکاری وظائف تجویز کئے گئے تو جو لوگ بالولاء کسی قبیلے میں شامل ہو گئے تھے ان کے وظیفے کا معیار بھی وہی رکھا گیا جو اس قبیلے کا تھا۔ امام شافعیؒ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب الاُم میں اس کی بعض تفصیلات دی ہیں۔ (جلد ۴، صفحہ ۱۵۸ طبع مصر، مکتبۃ الازہریہ) دیوان کا یہ نظام خلافت اسلامیہ میں صدیوں قائم رہا۔ امیر المؤمنین المہدی عباسیؒ کے زمانے تک باقی رہنے کا دستاویزی ثبوت الاُم کی یہی روایت ہے۔

مملوکوں کو سرکاری وظیفہ نہیں ملتا تھا، کیونکہ ان کے تمام اخراجات ان کے آقاؤں کے ذمے تھے۔ لیکن امیر المومنین عثمان الشہید الاکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت امیر ولیدؓ بن عقبہ کی گذارش پر مملوکوں کا بھی سرکاری خزانہ سے وظیفہ مقرر کر کے ان کی معاشرتی حیثیت بڑھا دی۔ طبری نے یہ بات امام شعبیؒ کے حوالے سے بیان کی ہے۔

امام صاحب کے نسب کے سلسلہ میں آپ کے جد بزرگوار زوطی تک سب کا اتفاق ہی۔ اس پر آ گئے۔ جو کہا گیا وہ بے ثبوت ہے۔ بعض لوگوں نے

زوطی) کے باپ دادا کو مسلمان اور عرب ثابت کرنے کے لئے آپ کا نسب نامہ اس طرح مرتب کر ڈالا۔ نعمان بن ثابت بن زوطی بن یحییٰ بن زید بن ثابت الانصاری التیمی تیم بن ثعلبہ (السہم المصیب فی الرد علی الخطیب ص ۳۷ طبع دیوبند) لیکن یہ محض اندھی عقیدت کی کرشمہ سازی ہے اور کسی درجے میں مستحسن نہیں۔

امام طحاوی نے مشکل الآثار میں امام صاحب کا بالولا تیمی ہونا خود ان کی زبان سے اس طرح بیان کیا ہے۔

قال ابو عبد الرحمٰن المقری اتیت ابا حنیفة فقال لی من الرجل؟ فقلت رجل منّ اللہ علیہ بالاسلام فقال لی لا تقل ھکذا و لکن وال بعض ھذہ الاحیاء ثم انتم الیھم فانی کنت انا کذلک۔

ابو عبد الرحمٰن مقری کہتے ہیں کہ میں ابو حنیفہ کی خدمت میں حاضر ہوا آپ نے پوچھا "کون ہو تم" میں نے عرض کیا ایک شخص جس پر اللہ نے اسلام کے ذریعہ احسان کیا ہے (یعنی نو مسلم) آپ نے فرمایا "یوں مت کہو" بلکہ ان عرب قبیلوں میں کسی سے رشتہ ولاء قائم کر لو اور پھر تم لوگ انہیں میں ہو جاؤ گے خود میں بھی ایسا ہی تھا۔

گویا تیم اللات سے آپ کی نسبت ولاء کی تھی، نہ کہ تیم بن ثعلبہ سے نسبی۔ اور صحیح طریقہ لکھنے کا یہ ہے "التیمی بالولاء" ویسے اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو شرف عطا فرمایا ہے اور جس رفعت سے نوازا ہے وہاں نسب کی کیا حاجت۔ آپ کے دادا زوطی اسلام لائے تھے اور ان زوطی کے دادا کا مسلمان یا عرب ہونا قطعاً غلط ہے۔ کوفے میں آنے والے آپ کے پہلے

زرگ یہی زوطی تھے۔ اور یہ وہ وقت تھا جب امیرالمؤمنین علیؓ نے مدینہ کے بجائے اس بستی کو اپنا دارالخلافہ بنالیا تھا۔ اس طرح یہ طبعی بات تھی کہ جناب زوطیؒ کو حضرت علیؓ سے عقیدت پیدا ہوگئی۔ کہتے ہیں کہ انھوں نے اپنے فرزند ثابتؒ کو امیرالمؤمنین کی خدمت میں پیش کیا تھا اور آپ نے ان کی لئے دعائیں کی تھیں۔ ان ہی ثابت بن زوطی کے فرزند جناب نعمان (ابوحنیفہؒ) تھے۔

حیثیت عرفی

طبقے کے اعتبار سے امام صاحب صغار تابعین میں ہیں۔ متعدد صحابہ کرام کی آپ نے زیارت کی تھی، مگر تمام علم آپ کا کبار تابعین کے فیوض پر مبنی ہے۔ تاریخ بغداد میں ہے (جلد ۱۳ صفحہ ۳۳۴)

دخل ابوحنیفة یوما علی المنصور وعنده عیسی بن موسی فقال للمنصور هذا عالم الدنیا الیوم۔ فقال له یا نعمان عمن اخذت العلم قال عن اصحاب عمر عن عمر، وعن اصحاب علی عن علی وعن اصحاب عبد الله عن عبد الله وعن اصحاب ابن عباس عن ابن عباس وما کان فی وقت ابن عباس علی وجه

ایک دن ابوحنیفہؒ (خلیفہ) المنصورؒ کے پاس آئے وہاں عیسیٰ بن موسیٰ عباسی بھی تھے انھوں نے المنصور سے عرض کیا، آج ساری دنیا میں یہ سب سے بڑے عالم ہیں (خلیفہ المنصور نے پوچھا نعمان تم نے علم کہاں کہاں حاصل کیا، عرض کیا اصحاب عمر سے عمر کا، اصحاب علی سے علی کا، اصحاب عبداللہ بن مسعودؓ سے عبداللہ کا اور اصحاب ابن عباس سے ابن عباس کا، اور ابن عباس کے وقت میں روئے زمین پر ان سے بڑا کوئی عالم نہ تھا

الارض اعلم منه۔ قال لقد استوثقت لنفسك

فرمایا تم نے اپنے نفس کی تکمیل بہت مضبوطی سے کی ہے۔

اسی طرح "دیار بکری" کی تاریخ خمیس میں ہے (ص ۲۸۹ ۲ طبع اول ۱۳۰۲ھ)

قال ابو حنیفة دخلت علی ابی جعفر امیر المؤمنین فقال لی عمن اخذت العلم؟ قال قلت عن حماد عن ابراهیم عن عمر الخطاب وعن علی بن ابی طالب وعبد الله بن مسعود وعبد الله بن العباس قال بخ بخ استوثقت ما شئت یا ابا حنیفة الطیبین الطاهرین المبارکین، رضی الله عنهم

(امام) ابو حنیفہ فرماتے ہیں میں ابو جعفر (المنصور) امیر المؤمنین کی خدمت میں حاضر ہوا، انھوں نے پوچھا "تم نے علم کہاں حاصل کیا ہے؟ میں نے عرض کیا امام حماد سے انھوں نے امام ابراہیم سے انھوں نے امیر المؤمنین) عمر بن الخطاب سے (امیر المؤمنین) علی بن ابی طالب سے حضرت عبد اللہ بن مسعود سے اور حضرت عبد اللہ بن عباس سے، فرمایا واہ واہ ابو حنیفہ تم نے تو اپنا مقصد پختگی کے ساتھ بڑے خوب و پاک اور مبارک حضرات سے حاصل کیا ہے، اللہ تعالیٰ ان سب سے راضی ہو۔

یہ صورت حال ان دونوں عظیم ہستیوں کی پہلی ملاقات کی ہے اس سے بھی واضح ہوا کہ امام صاحب کو صحابہ کرام کی بجائے ان کے اصحاب سے فیض ہے۔ ویسے آپ نے جن صحابہ کرام کی زیارت کی، ان کی وفات ایسے زمانے میں ہوئی کہ حضرت امام ان سے بخوبی استفادہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ بعض لوگوں

نے ان اصحابہ سے آپ کی بلا واسطہ روایتیں نقل بھی کی ہیں، لیکن ان کا ثبوت نہیں اور نہ امام صاحب نے ان سے اپنی کوئی روایت بیان کی ورنہ کتاب الآثار جو آپ کے شاگردوں نے آپ سے روایت کی ہے) اس میں کچھ تو اشارہ ہوتا۔

وجہ یہ ہے کہ معمر صحابہ اپنے آخری زمانہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشاد نقل کرنے سے گریز کرتے تھے کہ کہیں امتداد زمانہ کے سبب کوئی غلطی نہ ہو جائے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ امام صاحب کے یہاں روایت بیان کرنے کی شرط بڑی سخت ہے۔ وہ صرف ایسی روایت بیان کرنا جائز سمجھتے ہیں جو بالکل اسی طرح یاد ہو جس طرح پہلی دفعہ سنی۔ امام طحاویؒ نے بسند متصل لکھا ہے۔

قال ابو حنیفة لا ینبغی للرجل	ابو حنیفہؒ نے فرمایا کہ کسی شخص کو کوئی
ان یحدث من الحدیث الا	حدیث بیان کرنی جائز نہیں جب تک
بما حفظه من یوم سمعه	اسے روایت کرتے وقت بالکل اسی
الی یوم یحدث به	طرح یاد نہ ہو جس طرح پہلی مرتبہ سنی تھی

وہ تو اس بارے میں اتنے سخت ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی روایت دیکھے جو اسے پہلے سے زبانی یاد نہ ہو تو وہ اس کی روایت کی بھی اجازت نہیں دیتے (الکفایہ فی علم الروایہ صفحہ ۲۳۱ طبع حیدر آباد دکن) بہر حال امام صاحب نے جن صحابہ کی زیارت کی وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ مدینہ طیبہ:۔ حضرت سہل بن سعد الساعدی (م ۹۸ھ) مدینہ طیبہ میں وفات پانے والے آخری صحابی رضی اللہ عنہ

(۲) بصرہ:- حضرت انس بن مالک (م ۹۳ھ) بصرے میں وفات پانے والے آخری صحابی - امام صاحب نے ان کی زیارت متعدد بار کی رضی اللہ عنہ۔

۳- کوفہ:- حضرت عبداللہ بن ابی اوفٰی (م ۸۷ھ) کوفے میں وفات پانے والے آخری صحابی - یہیں صغار صحابہ میں ابوالطفیل عامر بن واثلہ کو بھی (م ۱۱۰ھ) رضی اللہ عنہ -

بعض لوگوں نے دوسرے صحابہ کے بھی نام لئے ہیں۔ لیکن انکی زیارت کا ثبوت مشکل ہے۔ کیونکہ امام صاحب بعہد امیر المؤمنین عبدالملک ۸۰ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ جو صحابہ اوپر مذکور ہوئے ان کی زیارت کر سکتے تھے اور ان سے روایت کا بھی امکان تھا۔ لیکن حضرت عبداللہ بن الحارث بن جزء الزبیدی (م ۸۶ھ) جو مصر میں وفات پانے والے آخری صحابی ہیں اور وہیں رہتے تھے، یا حضرت جابر بن عبداللہ انصاری (م ۶۸ھ) کی زیارت کا بھی امکان نہ تھا۔ چہ جائیکہ ان سے بلا واسطہ روایت کریں۔ البتہ حضرت یحییٰ بن معین نے جو جرح و تعدیل کے امام ہیں آپ کی روایت سیدہ عائشہ بنت عجرد سے سننے کی توثیق کی ہے اور یہ بڑی سند ہے۔ لیکن امام صاحب کے اپنے شاگردوں نے آپ کی جو مرویات نقل کی ہیں وہ کسی صحابی سے نہیں ہیں بلکہ تابعین سے ہیں۔ بات وہی معلوم ہوتی ہے کہ ان میں سے ہر صاحب شیخ فانی کے درجے میں تھے، انھیں خود ارشادات نبویہ نقل کرنے سے احتراز تھا۔ اور دوسرے امام صاحب کو اخذ روایت کے سلسلے میں بڑی شدت تھی۔ یعنی آپ نے کچھ سنا ہو تو اسے روایت نہیں کیا۔ ورنہ سات، گیارہ، اٹھارہ اور بیس

کی عمر میں آدمی بخوبی روایت کر سکتا ہے۔ خصوصاً جب کہ زمانہ ایسا ہو کہ اصحاب پاک دنیا سے اٹھتے جا رہے ہوں وہ زمانہ تو نہایت حرص کے ساتھ ان کی زیارت کرنے اور ان سے استفادے کا تھا۔

حضرت امام نے جن شیوخ سے استفادہ کیا وہ عموماً ہر قسم کی اندرونی سیاسی سرگرمیوں سے بے تعلق ہو کر محض علمی زندگی میں غرق تھے اور حسب تعلیمات ربانیہ (التوبہ ۹، ۱۲۲) انھوں نے اپنے آپ کو ترویج علوم کے لئے وقف کر دیا تھا اور عملی سیاست میں حصہ لے کر وقت ضائع کرنے پر تیار نہ تھے۔ یہی مسلک امام اعظمؒ کا تھا۔ آپ نے عملی سیاست سے کچھ سروکار نہ رکھا، جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا۔ علمی زندگی میں یکسوئی سے مشغول رہنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ معاش کی طرف سے بے فکر تھے۔ آپ کے ہاں کپڑے کا کاروبار اتنا وسیع تھا کہ معتمد گماشتے دور دور مال لے جاتے تھے، اس آمدنی سے آپ نے تعلیم کی اشاعت کا کام کیا، جہاں کوئی جوہر قابل نظر آیا، اسے معاش کی طرف سے بے فکر کر کے تحصیل علم پر لگا دیا۔ امام ابو یوسفؒ ایسے ہی خوش بخت حضرات میں تھے۔

کوفہ۔ فتح ایران کے بعد حضرت فاروق اعظمؓ کے فرمان کے مطابق حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے یہ نیا شہر بسایا، جو عرب و عجم کے درمیان بہت بڑی چھاؤنی تھی۔ اور تہذیبوں کا سنگم تھا۔ اسی لئے صحابہ کرامؓ کی توجہ اس بستی کی طرف بہت تھی۔ تاکہ دین کی جڑیں یہاں مضبوط ہوں اور تہذیبوں کے تصادم کا نتیجہ تخریبی نہ ہونے پائے۔ چنانچہ بہت جلد یہ شہر دنیائے اسلام کا علمی اور تہذیبی مرکز بن گیا۔ اور یہ سب کچھ اس کے دار الخلافہ بننے سے پہلے ہی ہو چکا تھا، حافظ ابو البشر دولابیؒ

نے کتاب الکنیٰ والاسماء میں حضرت قتادہؒ کے حوالے سے بیان کیا ہے۔

عن قتادة قال نزل الکوفة الف و خمسون رجلاً من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم واربعة وعشرون من اہل بدر۔

حضرت قتادہؒ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا کوفے میں ایک ہزار پچاس حضرات اصحاب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم میں سے یہاں تشریف لائے اور چوبیس اصحاب بدر۔

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ بانی کوفہ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ۔ حضرت حذیفہ بن یمانؓ۔ حضرت عمار بن یاسرؓ، حضرت براء بن عازبؓ وغیرہم کو حضرت فاروق اعظمؓ نے وقتاً فوقتاً یہاں بھیجا تھا، نظم ونسق کے علاوہ یہ حضرات دین کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ اور ان میں سب سے بڑی مسند عبداللہ بن مسعودؓ کی تھی۔

اس کے بعد امیرالمؤمنین معاویہؓ کے عہد مبارک و مسعود میں حضرت مغیرہ بن شعبہؓ اور حضرت جریر بن عبداللہؓ نے مسند ارشاد سجائی۔ علامہ ذہبی فرماتے ہیں۔

کوفے میں عبداللہ بن مسعودؓ، عمار بن یاسرؓ۔ علی بن ابی طالبؓ جیسے حضرات نیز صحابہ کرام کی کثیر تعداد نے اس شہر کو رونق بخشی۔ پھر علقمہؒ۔ مسروقؒ۔ اور اسودؒ جیسے ائمہ تابعین ہوئے۔ پھر شعبی، نخعیؒ، حکیم بن عتیبہؒ، حمادؒ، ابو اسحقؒ منصورؒ اور اعمشؒ جیسے ان کے اصحاب ہوئے اور یوں ابن عقدہ کے زمانے تک وہاں علم کی کثرت رہی یعنی چوتھی

صدی تک، ابوعبداللہ الحاکم کا بیان ہے کہ چوتھی صدی تک وہاں صحابہ کرام کی درسگاہوں کے نشانات باقی تھے فرماتے ہیں (معرفۃ علوم الحدیث ص ۱۹۱)

" میں کوفے میں سب سے پہلے ۳۱۱ھ میں داخل ہوا۔ ابوالحسن بن عقبہ شیبانی نے مجھے ایک ایک صحابی کی مسجد دکھائی۔ اور میں ان سب مسجدوں میں گیا۔ اس وقت یہ مسجدیں مراکز علمی کی حیثیت سے آباد تھیں۔ ہم نے اپنا ٹھکانہ، حضرت یزید بن عبداللہ رض کی مسجد کو بنایا "

لہذا، لوگوں کا یہ بیان صحیح نہیں کہ کوفے کی علمی حیثیت دارالخلافہ بننے کے بعد تھی۔ موفق املی نے لکھا ہے کہ جب حضرت علی رض کوفہ تشریف لائے تو وہاں کی مسجدوں کو حضرت عبداللہ مسعود رض کے تلامذہ سے بھرا پایا۔

لقد ترک ابن ام عبد یعنی ابن مسعود رضی اللہ عنہ هؤلاء سرج الکوفہ	ابن ام عبد یعنی ابن مسعود رض نے کوفے میں یہ روشن چراغ چھوڑے ہیں۔

غرض یہ ہے کہ کوفے کے دارالخلافہ بننے سے پہلے ہی یہ شہر علوم اسلامیہ کا مرکز بن چکا تھا۔ حضرت علی رض کا قیام یہاں جتنے دن رہا وہ زمانہ فتنوں کا تھا۔ اس لئے آپ کے فیوض سے اہل کوفہ نے چنداں فائدہ نہیں اٹھایا

شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں۔ (منهاج السنۃ ج ۴، ص ۱۴۷)

وانما ظهر علم علی و فقهه فی الکوفۃ بحسب مقامه فیها مدۃ خلافته	حضرت علی رض کا علم اور آپ کے فقہ کا ظہور کوفے میں اتنے ہی دن ہوا جتنے دن آپ خلافت کے دوران

وہاں رہے۔

پھر فرماتے ہیں۔

فانما کان الغالب علیہ فی الکوفۃ ومع ھذا فاھل الکوفۃ کانوا یعلمون القرآن والسنۃ قبل ان یتولی عثمان فضلاً علی علی۔

ان کے (یعنی حضرت علیؓ کے) علم کا ظہور زیادہ تر کوفے میں ہوا۔ مگر ساتھ ہی یہ ہے کہ حضرت علیؓ کی خلافت میں تو کیا، وہاں حضرت عثمانؓ کے خلیفہ ہونے سے بھی پہلے کتاب و سنت کا علم عام تھا۔

ساتھ ہی آپ نے وجہ بتائی ہے۔ (ص ۱۴۲)

فان اھل الکوفۃ التی کانت دارہ کانوا قد تعلموا الایمان والقرآن وتفسیرہ والفقہ والسنۃ عن ابن مسعود وغیرہ قبل ان یقدم علیؓ الکوفۃ۔

کیونکہ کوفہ جو آپ کا گھر تھا، وہاں کے لوگ ایمانیات، قرآن اور اس کی تفسیر اور فقہ و سنت کا علم ابن مسعودؓ وغیرہ کی خدمت میں حضرت علیؓ کی تشریف آوری سے پہلے حاصل کر چکے تھے۔

اسی طرح تصریح فرماتے ہیں۔ (ص ۱۵۷)

ولما ذھب الی الکوفۃ کان اھل الکوفۃ قبل ان یأتیھم قد اخذوا الدین عن سعد ابن ابی وقاص وابن مسعود وحذیفۃ وعمار وابی موسیٰ

جب وہ (یعنی حضرت علیؓ) کوفہ گئے ہیں تو انکی تشریف آوری سے پہلے ہی اہل کوفہ نے دین کا علم حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت حذیفہؓ، حضرت عمارؓ، حضرت ابو موسیٰ

وغیرهم ممن ارسله عمر الی الکوفة۔

وغیرہ حضرات سے حاصل کر رکھا تھا جنہیں حضرت فاروق اعظم رض نے وقتاً فوقتاً کوفہ بھیجا۔

محض اتنا ہی نہ تھا کہ اہلِ کوفہ اس علم پر اکتفا کریں جو انھیں کوفے میں حاصل ہوا۔ بلکہ وہ مدینہ طیبہ حاضر ہو کر وہاں سے بھی فیض یاب ہوتے تھے۔ (منہاج السنۃ، ج ۴، ص ۱۴۲)

هو (یعنی ابا عبد الرحمٰن السلمی) وغیرہ من علماء الکوفة مثل علقمة، والاسود والحارث الکلبی وزر ابن حبیش الذی قرأ علیه عاصم بن ابی الجنود، اخذوا القرآن عن ابن مسعود وکانوا یذهبون الی المدینة فیاخذون عن عمرؓ عائشة

وہ (یعنی حضرت ابو عبد الرحمٰن السلمی) وغیرہ علماء کوفہ مثلاً حضرت علقمہ حضرت اسود، حضرت حارثہ لیثی حضرت زر بن حبیش، جن سے حضرت عاصم بن ابی الجنود نے تجوید کا علم حاصل کیا، ان حضرات نے قرآن مجید کا علم حضرت ابن مسعود سے حاصل کیا تھا اور پھر مدینہ طیبہ جایا کرتے تھے تاکہ حضرت عمر رض اور حضرت ام المومنین عائشہ رض سے استفادہ کریں۔

موافق اساتذہ امام اعظمؒ جب تحصیل علم کے قابل ہوئے اور امام حمادؒ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا تو اپنے اساتذۂ کرام ہی کے طریقے پر چلے اور ان اساتذہ کا علم یہ تھا جیسا کہ بیان ہوا۔ کہ جو علوم انھیں کوفے کے دارالخلافہ بننے سے پہلے حاصل ہو چکے تھے۔ ان میں حضرت علی کے ایام خلافت سے کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں ہوا۔ اس لئے کہ حضرت علی رض کی

زندگی کے یہ آخری ایام جو کوفے میں گزرے ان کے لئے اتنے پریشان کن تھے اور ایسی ایسی مشکلات سامنے آتی رہتی تھیں جنھیں حل کرنے سے ہی آپکو فرصت نہ ملتی تھی۔ ان ہنگاموں نے آپ کو ایسا زچ کر رکھا تھا کہ علمی مسند سنبھالنے کا موقعہ نہ مل سکا۔ گویا اس عرصے میں امام اعظم رح کے اساتذہ ان سے استفادہ کا جو تھوڑا سا موقعہ ملا اس کی حیثیت ذیلی تھی اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے ارتقاء علمی میں حضرت علی رض کی تشریف آوری کچھ ممد ثابت ہوئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جو علم ان کے پاس پہلے سے تھا اسی پر وہ مطمئن رہے۔ اور فقہ علوی کی حیثیت ان کے ہاں ثانوی رہی۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رح فرماتے ہیں۔ (منہاج السنۃ ج ۴ ص ۱۴۰)

واعلم ان اهل الكوفة و اصحاب ابن مسعود كعلقمة والاسود و شريح والحارث بن قيس و عبيدة السلمانى و مسروق و زر بن حبيش و ابى وائل و غيرهم كانوا يفضلون علم عمر و ابن مسعود دون قول على رض

جان لو کہ اہل کوفہ اور اصحاب ابن مسعود، مثلاً علقمہ، اسود، شریح، حارث بن قیس، عبیدہ سلمانی، مسروق، زر بن حبیش اور ابو وائل وغیرہم، حضرت عمر رض اور حضرت ابن مسعود رض کے علم کو حضرت علی رض کے علم پر ترجیح دیا کرتے تھے۔

حضرت شریح جو امیر المومنین حضرت علی رض کے قاضی تھے وہ فقہی مسائل میں اپنا اجتہاد کام میں لاتے تھے۔ (منہاج السنۃ ج ۴، ص ۱۴۲)

وشريح قاضيه راى قاضى

ان کے (یعنی امیر المومنین علی رض

امیر المؤمنین علی) انّما تفقہ علی معاذ بن جبل بالیمن وکان یناظرہ فی الفقۃ ولا یقلدہ۔

قاضی (حضرت) شریح نے تمام علم حضرت معاذ بن جبلؓ سے یمن میں حاصل کیا تھا اور فقہی مسائل میں وہ ان سے (یعنی حضرت علیؓ سے) مناظرہ کیا کرتے تھے اور انکی تقلید نہیں کرتے تھے۔

حضرت علیؓ کے ایک دوسرے قاضی حضرت عبیدہ سلمانی کا بھی یہی حال تھا۔ ان کا یہ مشہور واقعہ ہے کہ حضرت علیؓ نے کوفے میں فرمایا میں پہلے توام الولد کو فروخت نہ کرنے کے سلسلے میں خلفاء پیشین کے مطابق رائے رکھتا تھا۔ لیکن اب میری رائے یہ ہے کہ اسے فروخت کیا جا سکتا ہے۔ اس پر آپ کے قاضی عبیدہ سلمانیؒ نے اٹھ کر کہا، آپ کی جو رائے جماعت کے ساتھ تھی وہی ہمیں آپ کے اکیلے کی رائے سے زیادہ قابل قبول ہے۔" آپ نے فرمایا "اچھا تو جیسا دستور چلا آرہا ہے اسی کو قائم رکھو۔" مسئلہ یہ تھا کہ جس باندی سے اولاد ہو جائے وہ اپنے آقا کی وفات پر خود بخود آزاد ہو جاتی ہے۔ اس لئے ایسی باندی (ام الولد) کو فروخت نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اولاد ہو جانے سے وہ عملاً مثل آزاد بیوی کے ہو گئی۔ ایسے ہی اور بھی فقہی اور تفسیری مسائل ہیں جہاں علماء کوفہ نے اپنی انفرادی رائے کے مقابلہ میں اجتماعی مذہب کے مطابق اپنا دستور العمل رکھا۔

ایک مشکل اور یہ آن پڑی تھی کہ حضرت علیؓ کو جو لوگ گھیرے ہوئے تھے وہ آپ کی موجودگی میں بھی غلط بیانی کر بیٹھتے تھے۔ آپ کی رائے کے خلاف چلتے تھے۔ اور آپ کی طرف وہ باتیں منسوب کر دیتے تھے، جو

آپ کے خواب و خیال میں بھی نہ ہوتیں اور پھر معلوم ہونے پر آپ کو انکی تردید کرنی پڑتی تھی۔ وقائع تاریخی میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں اس لئے علماء و فقہاء کوفہ آپ سے صرف وہی باتیں لیتے تھے جو خود اپنے کانوں سے سنیں اور ہنگامی احوال کے تحت ایسے مواقع کم ہی ہوتے تھے نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اہل کوفہ آپ کے علم سے وہ فائدہ نہ اٹھا سکے جو پرامن ماحول میں اٹھاتے، آپ کی طرف غلط باتیں منسوب کرنے کا یہ عالم تھا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی خدمت میں آپ کے فتاوے کا ایک مجموعہ پیش کیا گیا تو آپنے قلم اٹھایا اور کاٹتے چلے گئے۔ بار بار فرماتے "واللہ علی نے یہ ہرگز نہیں کہا ہوگا" اس مجموعے میں بہت تھوڑی باتیں ایسی رہ گئیں جو حضرت ابن عباسؓ نے آپ کی سمجھیں۔ یہ حال تھا اقوال علیؓ کا امام مسلمؒ نے اپنے مقدمے میں یہ واقعہ نقل کیا ہے۔ اسی لئے ان حضرات کے ہاں حضرت علیؓ سے سنی ہوئی روایات بہت تھوڑی ہیں اور ایسی کہ ان پر کسی فقہ کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی تھی۔ چنانچہ بات وہی رہی جو شیخ الاسلام نے فرمائی ہے کہ علماء کوفہ کے ہاں حضرت فاروق اعظمؓ اور حضرت ابن مسعودؓ کے ارشادات پر زیادہ تکیہ تھا۔

الشیوخ والفقہاء

علوم نبویہ کے حامل دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو شیوخ کہلاتے ہیں یعنی محدث اور دوسرے وہ جنہیں فقیہ کہا جاتا ہے۔ شیوخ یعنی محدثوں کا موضوع یہ ہے کہ حدیث کی روایت کریں، اسناد اور متن کی صحت و سقم سے بحث کر کے حدیث کا درجہ متعین کریں۔ فقہاء وہ ہیں جو صحیح احادیث کی روایت کے ساتھ ساتھ، ان سے مسائل کا استخراج کریں، خاص

وعام حکم کی پہچان ہو۔ اور ناسخ ومنسوخ کا درک رکھتے ہوں۔ کتاب وسنت سے کسی مسئلے پر جب اپنا مذہب مرتب کریں تو دلائل وبراہین سے اُسے ثابت بھی کر سکیں۔

چنانچہ جو حدیث شیوخ سے مروی ہو اس کے مقابلہ میں اس حدیث کو ترجیح دیجاتی ہے جس کی روایت فقہا کریں۔ خطیب بغدادیؒ فرماتے ہیں۔ (الکفایہ ص ۴۳۶) کہ حضرت وکیعؒ نے حضرت علی بن خشرمؒ سے پوچھا

ای الاسناد احب الیکم الاعمش عن ابی وائل عن عبد اللہ او سفیان عن منصور عن ابراھیم عن علقمہ عن عبد اللہ" ؟ فقلنا" الاعمش عن ابی وائل" فقال سبحان اللہ! الاعمش شیخ وابو وائل شیخ وسفیان فقیہ ومنصور فقیہ وابراھیم فقیہ وعلقمہ فقیہ وحدیث تداولہ الفقھاء خیر من ان یتداولہ الشیوخ

تمہیں کونسی سند زیادہ پسند ہے اعمش روایت کریں ابو وائل سے اور وہ عبد اللہ (بن مسعود) سے یا سفیان حوالہ دیں منصور کا اور وہ ابراہیم کا اور وہ علقمہ کا اور وہ عبد اللہ (بن مسعود) کا۔ ہم نے کہا "اعمش کی جو روایت ابو وائل کے ذریعہ ہو" فرمایا سبحان اللہ! اعمش شیخ ہیں اور ابو وائل شیخ ہیں لیکن سفیان فقیہ ہیں، منصور فقیہ ہیں ابراہیم فقیہ ہیں اور علقمہ فقیہ ہیں۔ جو حدیث فقہاء کے ہاں رائج ہو وہ اس سے بہتر ہے جو شیوخ کے ذریعہ رواج پائے۔

اعمش جس حدیث کی روایت ابو وائل سے کریں اور وہ ابن مسعود رضؓ سے

اس میں واسطے کم ہوں گے۔ اور ایسی حدیث کو "عالی" کہا جاتا ہے محدثوں کے ہاں اس کی بڑی قدر ہے۔ اور وہ کوشش کرتے ہیں کہ انھیں "عالی" حدیث ملے۔ سفیانؒ سے حضرت ابن مسعودؓ تک واسطے زیادہ ہیں، مگر راویوں کے فقیہ ہونے کے سبب اسے ترجیح دی جائے گی، کیونکہ اسے ان حضرات نے روایت کیا ہے جو دین کے نکات پر عبور رکھتے ہیں۔

یہ وکیعؒ (م ۱۹۷ھ) امام اعظمؒ کے اجلہ تلامذہ میں ہیں اور امام اعظمؒ امام شافعیؒ اور حضرت امام احمدؒ کے اجلہ اساتذہ ہیں۔ حدیث کے بارے میں ان کا بیان حجت مانا جاتا ہے۔ یہیں امام اعظمؒ اور ان کے تلامذہ کا طریقۂ کار معلوم کیا جا سکتا ہے کہ تحصیل علم کے لئے کن حضرات سے استفادہ انھیں عزیز تر تھا۔ حضرت امام کے شیوخ کی تعداد چار ہزار کے قریب بتائی جاتی ہے۔ لیکن استاذ اسے کہتے ہیں جس کی خدمت میں انسان ایک عرصے تک حاضر رہا ہو۔ کسی صنف علم میں اس سے تربیت حاصل کی ہو۔ اور خود جب درس دینے بیٹھے تو اس کے اقوال سے استشہاد کے ساتھ اپنے اجتہاد کی قوت بھی اس کے مذہب سے ثابت کرے۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ حضرت امام کا عمومی رجحان اپنے اساتذہ کرام کی طرح فقہ فاروقیؓ اور علم ابن مسعودؓ کی طرف ہونا چاہیئے۔ اور واقعی تھا بھی، جیسا کہ ان کے اپنے بیانوں اور ان کے مدوّن مذہب سے عیاں ہے ایسا ہونے کی ایک وجہ اور بھی تھی کہ انھوں نے حضرت عطاؒ بن ابی رباح سے خاص فیض اٹھایا تھا اور وہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن

عباس رضؓ کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ اور یہ دونوں بزرگوار وہ ہیں جنہیں شرف صحابیت کے ساتھ یہ امتیاز بھی حاصل تھا کہ فیوض فاروقی سے بہرہ وافر رکھنے کے سبب ان کا شمار امت کے عظیم ترین فقہاء میں ہوا۔

اب بعض لوگ بیان کرتے ہیں اور بلا تحقیق بڑی تحدی سے کہ حضرت امام اعظمؒ نے جناب محمد الباقرؒ اور ان کے فرزند جعفر الصادقؒ سے باقاعدہ تحصیل علم کی تھی۔ اور ان دونوں کے علاوہ عبداللہ المحض اور زید بن علی بن الحسینؒ سے بھی انھیں خاص فیض تھا اسی لئے ان کے اندر شیعیت کی طرف میلان پیدا ہو گیا تھا۔ یہ بیان جس کسی کا بھی ہو از سرتا پا غلط ہے۔ اس سلسلہ میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں (منہاج السنۃ ج ۴، ص ۱۴۳)

ان هذا من الكذب الذي يعرفه من له ادنى علم فان ابا حنيفة من اقران جعفر الصادق، توفي الصادق سنة ثمان و اربعين وتوفي ابو حنيفة سنة خمسين ومائة و كان ابو حنيفة يفتي في حيوة ابي جعفر والد الصادق وما يعرف ان ابا حنيفة اخذ عن

یہ ایک ایسا جھوٹ ہے جسے ادنیٰ علم کا آدمی بھی جانتا ہے، کیونکہ ابو حنیفہ تو جعفر الصادقؒ کے ہم طبقہ ہیں۔ صادقؒ کی رحلت ۱۴۸ھ کی ہے اور ابو حنیفہ نے ۱۵۰ھ میں وفات پائی۔ ابو حنیفہؒ تو صادقؒ کے والد ابو جعفر کے زمانہ میں فتویٰ دیا کرتے تھے۔ اور ایسی کوئی بات معروف نہیں کہ ابو حنیفہ نے جعفر الصادق یا ان کے والد سے کوئی ایک مسئلہ بھی لیا ہو

جعفر الصادق ولا عن ابیہ مسئلۃ واحدۃ بل اخذ عمن کان اسن منہما لعطاء بن ابی رباح وشیخہ الاصلی حماد بن ابی سلیمان۔

بلکہ انھوں نے علم ان بزرگواروں سے حاصل کیا جو ان دونوں سے زیادہ معمر تھے جیسے عطاء بن ابی رباح رح اور ان کے اصلی استاد امام حماد ابن ابی سلیمان رح

رہی یہ بات کہ محمد الباقر رح عبد اللہ المحض یا جعفر الصادق رح اور زید بن علی بن حسین رح وغیرہم سے ان کی صحبتیں رہی ہوں، علمی مذاکرات ہوئے ہوں تو کچھ بعید نہیں، کیونکہ یہ حضرات مدینہ طیبہ میں رہتے تھے، اور امام اعظم رح جب حج کے موقعہ پر حرمین شریفین حاضر ہوتے ہوں گے تو ان سے ملاقات بھی کرتے ہوں گے۔ ایک دوسرے کی تعظیم و تکریم بھی ہوتی ہوگی جو اصحاب علم کا شعار ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی کیسے ہوگئے۔ کہ امام صاحب نے اپنے ان ہم عصر حضرات سے اخذ علم کیا اور اس تعلق سے انہیں شیعہ بنا یا جائے۔

علاوہ ازیں دیکھنا چاہیئے کہ علوی اکابر مدینہ طیبہ میں رہتے تھے امام صاحب کا قیام مکہ معظمہ میں تو ثابت ہے مگر مدینے میں مستقل طور پر رہنا ثابت نہیں لہذا بعض لوگوں کا یہ قول کہ زید بن علی بن الحسین سے امام صاحب نے باقاعدہ تحصیل علم کیا کسی طرح صحیح نہیں۔ اول تو اس لئے کہ جب امام صاحب نے ان کے برادر بزرگ محمد الباقر رح ہی سے اکتساب علم نہیں کیا تو ان سے کیا کرتے۔ پھر یہ ہے کہ جناب زید اگرچہ کچھ عرصہ کوفے میں رہے۔ مگر یہ زمانہ ان کے سیاسی جوڑ توڑ کا تھا۔ اور خلافت قائم

کے خلاف وہ خفیہ ریشہ دوانیوں میں مشغول رہے۔ اس کا موقعہ ہی کہاں تھا کہ وہ علمی محفلیں منعقد کر سکیں اور لوگ طلب علم کے لئے ان کے پاس آئیں۔ امام اعظمؒ اور ان کے اساتذہ کرام کے مسلک کے مطابق یہ مناسب بھی نہ تھا کہ وہ جناب زید کے پاس جاکر اپنی بیعت مشکوک بنالیں جو حسب فرمان نبوی کسی طرح جائز نہیں۔

مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ نے النافع الکبیر لمن یطالع الجامع الکبیر میں رجال حنفیہ کے تحت (ص ۱۴، طبع مصطفائی) شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے مذکورہ بالا بیان کی تردید کی ہے اور مشکوۃ المصابیح کے مؤلف ولی الدین ابوعبداللہؒ کے اس بیان کا حوالہ دیا ہے جو انھوں نے رجال مشکوٰۃ کے تراجم میں جعفر الصادقؒ کی بابت لکھا ہے

سمع منہ الائمۃ الاسلام الاعلام نحو یحیی بن سعید وابن جریج، ومالک بن انس والثوری وابن عینیۃ وابو حنیفۃ	ان سے (یعنی صادق سے) اکابر ائمہ نے حدیث کی سماعت کی ہے مثلاً یحیٰی بن سعید نے، ابن جریج نے مالک بن انس نے، سفیان ثوری نے سفیان بن عینیہ نے اور ابوحنیفہ نے

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور ولی الدینؒ دونوں آٹھویں صدی کے بزرگ ہیں۔ اگر بات ان کے اپنے زمانے کی ہوتی تو ایک کا قول دوسرے کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا تھا۔ گو پھر بھی قرائن سے وجہ ترجیح معلوم کی جاتی یہاں معاملہ ہے دوسری صدی ہجری کا اور اس کے لئے دلیل قریب العہد مصنف کے بیان سے لائی گئی۔ علاوہ ازیں شیخ الاسلام محقق ہیں اور ولی الدین محض ناقل۔ ظاہر ہے کہ ناقل کے مقابلہ میں

محقق کا قول قابل ترجیح ہے جب تک اس کے خلاف دلیل سامنے نہ آجائے
ولی الدینؒ نے رجال کے تراجم میں تحقیق سے کام نہیں لیا۔ پانچویں، چھٹی
صدی ہجری میں جو باتیں مشہور ہو چکی تھیں وہی لکھ دیں مثلاً حضرت
سعید بن جبیرؓ اور امیر حجاجؒ بن یوسف کے مابین جو کچھ لکھا ہے وہ خالص
افسانوی ہے۔ ایسے ہی امام اعظمؒ کے متعلق وہی خرافات نقل کر دی ہیں
کہ امیر ابن ہبیرہؒ اور امیر المؤمنین المنصورؒ نے انھیں عہدۂ قضا قبول
کرنے پر قید دیند اور تازیانوں کی سزا دی اور محبس میں ان کی وفات ہوئی
ایسے ہی متعدد رجال کے کوائف جو انھوں نے نقل کئے ہیں وہ اہلِ تحقیق
کے نزدیک قابلِ قبول نہیں۔

پھر دیکھنا چاہیئے کہ شیخ الاسلام کی عبارت میں یہ کہاں ہے کہ
امام اعظم اور جعفر الصادق کی کبھی ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ ان سے انھوں
نے کوئی حدیث ہی نہیں سنی اور ان کے مابین کبھی علمی مذاکرات ہی نہیں
ہوئے۔ وہ تو یہ فرماتے ہیں کہ "یہ بات جانی پہچانی نہیں کہ ابو حنیفہؒ نے
جعفر الصادقؒ یا ان کے والد ماجد سے کوئی ایک مسئلہ بھی لیا ہو" یعنی
انھوں نے اپنے فقہ کی تدوین میں فقہ جعفری سے کوئی مدد نہیں لی، اور نہ
اپنے دلائل میں انھوں نے ان دونوں بزرگواروں کے اقوال کو بطور حجت
پیش کیا۔ امام صاحب نے سیکڑوں بزرگواروں سے روایات سنیں ایسے
ہی جناب صادق اور جناب باقر سے بھی سنی ہوں گی۔ امام صاحب کو تو
اپنے چھوٹوں سے استفادے میں بھی عار نہ تھا۔ اور یہ دونوں تو بلند پایہ
تھے۔ یہاں سوال ان کی شخصیتوں کی بلندی اور ان سے استفادے
کی اہلیت کا نہیں۔ بلکہ تاریخی حیثیت سے ان سے استفادے کے

ثبوت کا ہے۔ جو نہیں ملتا۔ اور ملتا بھی کہاں سے کیونکہ جسے فقہ جعفری کہا جاتا ہے اس کا ذکر چوتھی صدی ہجری میں اس وقت سامنے آیا جب بویہی شیعہ حکومت نے پر پرزے نکالے اور اس فقہ کی باقاعدہ تدوین صفوی دور میں ہوئی۔

امام اعظمؒ عراقی تھے اور گاہے گاہے مختصر ساعات میں انکی ملاقات جعفر الصادقؒ سے ہوئی ہوگی۔ لیکن امام مالکؒ خاص مدینہ طیبہ میں رہتے تھے۔ اور شاید روزانہ ہی جناب صادقؒ سے ملاقات ہوتی ہو، اب مؤطا شریف موجود ہے اس میں دیکھا جائے کہ جناب صادقؒ سے کتنی روایتیں لی گئی ہیں۔ صرف معدودے چند۔ اس میں کثرت نظر آتی ہے مالکؒ عن نافع عن ابن عمرؓ کی اور یہ سلسلۃ الذہب کہلاتا ہے جو درجہ حضرت مالکؒ کے ہاں اس سند کا ہے۔ وہی درجہ امام اعظمؒ کے ہاں ابو حنیفہ عن عطاء عن ابن عباسؓ کا ہے۔

علاوہ ازیں روایت لینا اور بات ہے اور اپنا مذہب متعین کرنا بالکل دوسری بات۔ چنانچہ جن حضرات کے ذریعہ فقہ کی تعلیم عام ہوئی ان میں امام ابن قیمؒ نے علم مدینہ کے لئے حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا نام بتایا ہے۔ اہل مکہ کے لئے حضرت ابن عباسؓ کا اور اہل عراق کے لئے حضرت ابن مسعودؓ کا اس ذیل میں جناب جعفر الصادقؒ کا نام کہیں نہیں ملتا۔ وہ بھی منجملہ ہزار ہا علماء کے تھے، مگر جہاں تک ان سے علم حاصل کرنے کا سوال ہے تو ائمہ فقہ نے اس کیلئے توجہ دوسرے حضرات کی طرف کی۔ جیسا کہ عرض کیا گیا اخذ روایت اور تعیین فقہ دو مختلف باتیں ہیں۔ فلاں نے فلاں سے روایت لی۔

تو اس سلسلے میں بیسیوں بلکہ سکڑوں کا نام لیا جاتا ہے لیکن جب کہا
جاتا ہے فلاں تفقہ علی فلاں تو وہاں صرف دو تین ہی نام
جاتے ہیں۔ یعنی فلاں نے فلاں کی خدمت میں حاضر رہ کر حدیث و فقہ
عبور حاصل کیا ہے، استاد ایسے ہی بزرگواروں کو کہا جاتا ہے نہ کہ ہر شخص
کو جس سے کسی نے کوئی روایت لی ہو جناب محمد الباقرؒ نے تو امیر المؤمنین
یزیدؒ کی والدہ ماجدہ سیدہ میمونؓ سے روایت لی ہے تو کیا انھیں ان کا
شاگرد کہا جائے گا۔

امام ابو حنیفہؒ اور سیاسی ہنگامے

ائمہ فقہ و حدیث کے بارے میں عموماً اور ابو حنیفہؒ کے متعلق خصوصاً
عجیب و غریب روایتیں وضع کی گئی ہیں یا تو ان کی علمی حیثیت گرانے کی غرض
سے یا یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہ شیعہ تھے یا شیعیت کی طرف مائل کیو
بقول رواۃ وہ ان طالبیوں اور علویوں کے عقیدت مند تھے جنہوں نے
وقتاً فوقتاً خلافت قائمہ کے خلاف خروج اور بغاوتیں کیں

اہل تشیع کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد
نزول قرآن کی غایت اور امت مسلمہ کی تشکیل سے غرض طرح طرح
یہ بتائی گئی ہے کہ دنیا پر آل علی کے اقتدار کا پرچم لہرائے اور تا قیام
اسی خانوادے کے ہاتھ میں امت کی زمام کار رہے۔ باقی مسلمان
تابعداری کے مکلف ہیں اور بس۔ لیکن ہوا یہ کہ نہ آل علی کو سیاسی اقتدار
نصیب ہوا۔ اور نہ علمی حیثیت سے وہ ایسا مقام حاصل کر سکے کہ

کو چھوڑ کر لوگ تحصیل علم اور اکتساب نور کے لئے محض ان کی طرف مائل ہوں اور انھیں کے فیوض دنیا میں پھیلیں۔ یوں تو اس علوی خانوادے میں بھی بڑے بڑے حضرات گزرے ہیں جن سے امت فیض لیتی چلی آرہی ہے۔ مگر مقام اور مرتبے کے اعتبار سے ان کی حیثیت منجملہ دیگر اکابر امت رہی۔ امت محمدیہ جیسی غیر طبقاتی امت میں پیدائشی بزرگی کا کب تصور ہو سکتا ہے۔ اس لئے وہی کیا گیا جو شکست خوردہ لوگوں کا طریقہ ہے کہ آل علی کے فضائل و مناقب کی موضوعات کے علاوہ ابو طالب تک کے اسلام اور روحانی برتری کے ثبوت کے لئے روایتوں کا ایک طومار باندھ دیا گیا۔ اور غلو میں نصاریٰ کو بھی مات کر دیا۔ نتیجے میں صحابہ کرام، خلفاء اسلام اور علماء و فقہاء امت پر طعن و تشنیع کا بازار گرم ہو گیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ ایک لاکھ سے زیادہ تھے۔ جن میں ہزار سے زیادہ کبار صحابہ ہیں ان کی حیثیت ثانوی اور غیر اہم بنا دی گئی۔ بلکہ ان کی تکفیر و تفسیق و ارتداد تک نوبت پہنچا دی گئی۔ معارف قرآنیہ اور انوار نبوی کا گنجینہ حضرت علیؓ اور ان کی اولاد کو قرار دیا گیا اور اکابر صحابہ کی موجودگی میں ان کے سامنے کے ان طالبی اور علوی بچوں کو ان سے افضل و اقدس و انور ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ جنھیں نہ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف نصیب ہوا، نہ اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے جان کی بازی لگانے کا اور نہ نشر و اشاعت دین کے لئے حلقہائے درس قائم کرنے کا۔[1]

---

[1] فقہاء صحابہ میں عبادلہ اربعہ ہیں یعنی خلفاء اربعہ کے بعد اپنے زمانہ میں ربانی شہ پر

لیکن یہ کام چل نہیں سکتا تھا۔ جب کہ امت کے اکابر علماء، وفقہاء کو۔۔۔

(بقیہ حاشیہ) شیخ الصحابہ حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہم اور مدینہ کے فقہا اربعہ بزمانہ تابعین چار بزرگوار ہیں۔ حضرت سعید بن مسیب۔ حضرت عروہ بن الزبیر، حضرت عبدالملک بن مروانؒ اور قبیصہ بن الذویبؒ۔ ان کے بعد جن حضرات کو سبعہ کہا جاتا ہے تو مراد ہوتے ہیں حضرت سعید بن مسیبؒ، حضرت عروہ بن الزبیر، حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکرؒ۔ حضرت خارجہ بن زید بن ثابتؒ۔ حضرت عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعودؒ، حضرت سلیمان بن یسارؒ اور ساتویں کے بارے میں اختلاف ہے بعض کے نزدیک حضرت سالم بن عبداللہ بن عمرؒ ہیں اور بعض کے نزدیک حضرت ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن الحارث بن ہشامؒ ہیں۔ یہاں حضرت عبدالملک بن مروان کا نام نہیں لیا جاتا۔ کیونکہ ان کا شمار پھر خلفاء اسلام اور امراء المومنین میں ہو گیا۔ اور حضرت قبیصہؒ کا نام اس لئے نہیں کہ وہ شام تشریف لے گئے تھے۔ اور اموی خلافت کے عدلیہ کا انتظام سنبھال لیا تھا۔ جن حضرات کے نزدیک ساتویں فقیہ مدینہ حضرت ابوبکر بن عبدالرحمٰنؒ ہیں ان میں سے ایک صاحب نے ساتوں کے نام اس طرح نظم کر دئیے ہیں۔

الا من لا یقتدی بائمۃ   فقسمتہ ضیزیٰ من الحق خارجہ

یاد رکھو جو شخص ان اماموں کی اقتداء نہیں کرتا۔ اس کی قسمت کھوٹی ہے اور وہ حق سے باہر ہو گیا۔

فخذھم عبید اللہ عروۃ قاسمٌ   سعیدٌ ابوبکرٍ سلیمانُ خارجہ

تو انہیں گن لو وہ عبید اللہ (بن عبداللہ بن عتبہ) ہیں، عروہ (بن الزبیر) ہیں، قاسم (بن محمد بن ابی بکر) ہیں سعید بن المسیب ہیں۔ ابوبکر (بن عبدالرحمٰن) ہیں سلیمان (بن یسار) ہیں اور خارجہ (بن زید) ہیں

کسی درجے میں اپنا ہم خیال ثابت نہ کرلیں - تاکہ عوام کو ان روایات واہیہ سے متاثر کرکے سلف کرام سے بدظن کرنے کی مہم سر کی جائے اس غرض سے سب سے زیادہ توجہ امام اعظم ابوحنیفہؒ کی طرف کی گئی - کیونکہ وہ عجمی الاصل تھے اور کوفی ہونے کے سبب یہ بیان قرین عقل باور کرایا جا سکتا تھا کہ ان کی ہمدردیاں آلِ علیؓ کے ساتھ تھیں - اور ان کے نزدیک خلافت قائمہ کے خلاف خروج کرنے میں وہ حق بجانب تھے -

اس طرح خلفاءِ اسلام اور ان کے امراء کو جو سیاسیات اسلامیہ کی تشکیل وارتقاء کی ذمہ داریاں اٹھائے ہوئے تھے انھیں دنیا دار ٹھہرا کر ان کے اور ائمہ فقہ وحدیث کے مابین تعارض وتنافر کی خود ساختہ روایات کو فروغ دیا گیا حقائق بدیہیہ کو اس طرح دبا یا گیا کہ عام تعلیم یافتہ آدمی بہک جائے، نشرو اشاعت کی اس کثرت کا نتیجہ یہ مرتب ہوا کہ آج عالم یہ ہے کہ اچھے اچھے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱) انہی حضرات سے تمام فقہاء وائمہ حدیث استناد کرتے ہیں صحاح ستہ کے سب مصنفوں نے انکی روایات لی ہیں انمیں عروہ بن الزبیر حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی کے سگے بھانجے اور تربیت دادہ تھے، حضرت قاسم بن محمد اور حضرت سالم بن عبداللہ دونوں حضرات ام المؤمنین عائشہ صدیقہ کے بھتیجے اور تربیت دادہ تھے، حضرت سلیمان بن یسار ام المؤمنین سیدہ میمونہ کے مولیٰ اور تربیت دادہ تھے، حضرت خارجہ اپنے والد ماجد سیدنا زید بن ثابتؓ کے تربیت دادہ تھے ان حضرات نے بکثرت صحابہ کی صحبت اٹھائی تھی انمیں سے چھ سے امام ابن شہاب زہری نے فیض اٹھایا اور ان سے امام مالکؒ نے، حضرت سلیمان بن یسار سے حضرت یحییٰ بن سعید اور ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن نے اور ان سے امام مالکؒ نے

پڑھے لکھے لوگ ان خرافات کو واقعات سمجھ کر امت کے ائمہ و خلفاء کا تذکرہ ایسے کرتے ہیں جیسے وہ دشمنانِ ملت ہوں اور ان کی علمی و روحانی حیثیت بلند نہ ہو۔

امام صاحب کے زمانے میں آلِ علی میں سے تین اہم شخصیتوں نے خروج کئے۔ یعنی زید بن علی بن الحسین، محمد الارقط بن عبد اللہ بن الحسن بن الحسنؓ اور ان کے بھائی ابراہیم لے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت امام کی ہمدردیاں ان تینوں کے ساتھ تھیں۔ اور وہ اموی و عباسی خلفاء کو غاصبِ خلافت اور نااہل امامت سمجھتے تھے۔ دیکھنا یہ ہے کہ عقلاً و نقلاً صحیح صورت حال کیا ہے اور یہ کہ ایسا تصور کذب و افتراء تو نہیں۔ چنانچہ کتاب و سنت، مذہب امام، مواقف تلامذۂ امام اور حقائق تاریخیہ سے تو یہ سب کچھ افتراء محض ہی ثابت ہوتا ہے۔

امام ابو حنیفہؒ اور زید بن علی بن حسینؒ

زید جناب علی زین العابدینؒ کے فرزند تھے۔ اپنے والد ماجد اور برادر بزرگ محمد الباقرؒ کے برخلاف ان میں غیر معمولی ترفع نفس تھا اور چاہتے تھے کہ ہم نسب اور ہم چشم لوگوں میں اپنا امتیاز قائم کریں، چنانچہ ان کی پہلی جھڑپ اپنے ابن عم عبد اللہ المحض بن الحسن بن علیؓ بن ابی طالب سے ہوئی۔

خیبر اور فدک وغیرہ کا جو حصہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد۔ آپ کا خاص کر دیا گیا تھا۔ اور اسے وقف کی صورت دیدی گئی تھی اس کے پہلے متولی حضرت صدیق اکبرؓ ہوئے۔ پھر حضرت فاروق اعظمؓ، فاروقی عہد میں یہ تولیت حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ کے سپرد کر دی گئی۔ عہد عثمانی میں حضرت عباسؓ کی وفات کے بعد اس کے متولی تنہا حضرت علیؓ رہے۔ آلِ

عباسؓ نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا، کیونکہ وہ ان سب کے بڑے بھائی تھے اور حق والوں کا حق ان کے ہاتھ میں محفوظ تھا۔

حضرت علیؓ کے بعد ان کے متولی حضرت حسنؓ ہوئے۔ ان کے بعد اس کی لشترکہ تولیت علی بن الحسینؒ اور حسن المثنیٰ بن الحسنؒ کے سپرد ہوئی لیکن علی بن الحسین کے بعد اس کے تنہا متولی حسن المثنیٰ رہ گئے۔ اور ان کے بعد یہ تولیت ہاشمی خاندانی وقف کی، ان کے فرزند ارجمند زید بن الحسن المثنیٰ کو ملی (صحیح بخاری کتاب المغازی حدیث بنی النضیر) پھر ان زید کے بعد یہ تولیت ان کے بھائی عبداللہ المحض کو ملی۔ اس طرح وقف کا التزام آلِ حسن کے ہاتھ میں چلا گیا کسی حسینی یا عباسی کو اس پر اعتراض نہ ہوا۔ کیونکہ یہ تولیت تھی اور ناجائز تصرف کا اس پر امکان نہ تھا۔ گویا پورے اموی دور میں اور ابتدائے عباسی عہد تک خلفاء اسلام نے اسی حسنی خاندان میں اس تولیت کا سلسلہ قائم رکھا۔ حضرت مروانؒ اور ان کی اولاد امجاد میں جو خلفاء ہوئے، ان کے بارے میں یہ جھوٹی روایتیں مشہور کی گئیں کہ انھوں نے اس جائداد پر قبضہ کر لیا تھا اور خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے پھر حقداروں کو دید یا تھا۔

زید بن علی بن حسین کو یہ صورت ناگوار تھی کہ حسینیوں میں تولیت رہے وہ تو اس تولیت میں شرکت چاہتے تھے۔ مگر عبداللہ المحض نے تمام بنو ہاشم کی حمایت کے سبب اسے منظور نہ کیا۔ دونوں میں جھگڑا بڑھا حتیٰ کہ راویوں کے بقول جناب زید چونکہ کنیز کے بطن سے تھے فریقین کے درمیان قبیح قسم کی بدکلامی بھی ہوئی۔ پھر مقدمہ امیر مدینہ کے ہاں پیش ہوا۔ وہاں بھی دونوں نے ایک دوسرے کو سخت سست کہا، اور باہمی پست قسم کے طعنے دئیے اس پر امیر مدینہ نے قریش اور انصار کا جرگہ طلب کر کے اس قضیئے کا فیصلہ چاہا۔ لیکن وہ فیصلہ جناب زید

کے خلاف ہوا۔ انھوں نے اس کا مرافعہ امیر المومنین ہشامؒ کے ہاں کیا مگر وہاں بھی ناکامی ہوئی۔ ایسا ہی ایک مالی جھگڑا ان کا امیر عمر بن امیر المومنین ولید سے اور اس معاملہ میں بھی فیصلہ زید کے خلاف رہا۔ اسی قسم کے اور بھی معاملات یعنی زر، زمین کے جھگڑے تھے۔ ان سب میں امیر المومنین کے ہاں زید کے مطالبات کی پذیرائی نہیں ہوئی۔ طبری نے اپنے تشیع کے باوجود کئی صفحوں پر یہ سب روایتیں تفصیلاً بیان کی ہیں انھیں پڑھ کر کوئی باوقار آدمی کہے ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

غرض یہ ہے کہ جناب زید کا کوئی معاملہ سیاسی، دینی یا نظریاتی نہ تھا مالی تھا۔ اور وہ بھی باہمی پست نزاع پر مبنی۔ طبری کی کسی روایت میں کوئی بات ایسی مذکور نہیں جس سے زید کے معاملات میں کوئی رفعت نظر آئے لیکن ان ناکامی کے سبب وہ ایسے زچ ہوئے کہ جذبات میں ہیجان پیدا ہو گیا۔ کوفے کے سبائیوں نے ان کی نفسیاتی کیفیت بھانپ لی اور انھیں اپنے ہاں بلا کر ان پر ابھارا۔ وہ خود بھی امیر المومنین سے اپنے غیظ و غضب میں یہ کہہ کر آئے تھے "اخرج ثم لا تراني الا حيث تكره" (میں جاتو رہا ہوں مگر مجھے ایسی حالت میں پائیں گے کہ آپ کو ناگوار ہوگی) اسی لئے دمشق سے مدینہ طیبہ واپس ہونے کے بجائے کوفے پہنچ گئے تھے، اور سبائیوں کے بھرے میں آ کر خروج کر بیٹھے۔

مگر ان کی حسن تدبیر کا یہ عالم تھا کہ وقت پر دو سو آدمیوں سے زیادہ ان کے ساتھ نہ تھے۔ تین بر اعظموں میں جس اموی امام کا پرچم لہرا رہا تھا اور ہم عصر امت جسے ایک مثالی حکمران سمجھتی تھی، اس کے مقابلے میں دو سو آدمیوں کا بغاوت کرنا سوائے فساد فی الارض کے اور کیا تھا۔ اب غور طلب

ہے کہ شیخ ابوزہرہ جیسے نزراتہ شخص نے ہوا پرست راویوں کی یہ روایت قبول لی کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ نے اس خروج میں زید کی حمایت کی تھی اور اسے غزوہ بدر کے مماثل قرار دیا تھا۔ مگر عملاً ساتھ دینے کے بجائے کچھ رقم بطور امداد دیکر گھر میں بیٹھ رہے۔

جناب زید کا خروج سنہ ۱۲۰ھ کا ہے۔ یعنی اس وقت امام ابوحنیفہؒ مجتہد مطلق ہونے کے درجہ پر نہ تھے، بلکہ ہزارہا علماء میں سے وہ بھی ایک عالم تھے جن کا نہ فتویٰ کوئی امتیازی درجہ رکھتا تھا اور نہ عمل، ان کے استاد امام حمادؒ یا تو زندہ تھے یا انھیں وفات پائے اور امام صاحب کو ان کی مسند سنبھالے چند ہی دن ہوئے تھے، کیونکہ امام حمادؒ کی وفات بھی سنہ ۱۲۰ھ ہی کی ہے۔ امام صاحب کی اس وقت یہ حیثیت نہ تھی کہ اپنے شیخ کے موقف کے خلاف کوئی اقدام کر لیا کیونکہ اس طرح وہ حضرت حمادؒ کے تلامذہ میں اپنا وقار کھو بیٹھتے، اختلاف کرنے کا درجہ تو انھیں بہت بعد میں ملا۔

اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اگر بفرض محال امام صاحب نے اپنے اساتذہ کرام کے مواقف سے ہٹنے کی جرأت کی اور صمیم قلب سے یہ جانا کہ زید حق پر ہیں، ان کے خروج میں مصلحت ملیہ ہے اور ان کا ساتھ دینا ایسا ہی ہے، جیسے غزوہ بدر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہو کر کفار سے نبرد آزما ہوتا، یعنی انھوں نے امت کے متفق علیہ امام ہشام امیر المؤمنین کو ابوجہل کی طرح سمجھا۔ ان کے اعوان و انصار اور علماء و فقہاء، امت کے علاوہ جمہور بنی امیہ و بنو ہاشم کو کفار مکہ کی طرح جانا، پھر ان کے مقابلہ میں جناب زید کی شان سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سی قرار دی اور ان کے نزدیک دو سو کوتی جو جناب زید کے ساتھ میدان میں آئے وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ان

۳۱۳ جانباز ساتھیوں کا درجہ رکھتے تھے۔ جنھوں نے بدر کے میدان میں کفر کا جھنڈا سرنگوں کیا تھا۔ تو امام صاحب کو سو برس بعد بآسانی شہدا بدر کا درجہ حاصل کرنے میں کیا چیز مانع تھی۔

اگر ایک شخص کو اطمینان ہو کہ جان دیکر اللہ کے ہاں اس کا شمار بدر کے غازیوں اور شہیدوں میں ہو گا تو اسے تو اس معرکے میں جناب زید کے پہلو بہ پہلو لڑنا تھا۔ یہ کیا بات ہوئی کہ کچھ مال دے کر گھر بیٹھ رہے۔ خدا اور رسول کی نام پر جو بیعت امیر المؤمنین سے کی تھی اسے بھی توڑا، اور حاصل یہ ہوا کہ نہ غازیوں میں رہے اور نہ شہیدوں میں!۔ امام صاحب جیسے اعلم و اتقی کے متعلق اور دوسرے لوگوں کی بیان کردہ یہ روایت ہیچ محض ہے اور کسی درجے میں اسے قبول نہیں کیا جا سکتا۔ امام صاحب نے چونکہ زید کا ساتھ نہیں دیا اور امیر کوفہ نے انھیں اس میں ملوث سمجھا۔ اس لئے یہ ناپاک روایت وضع کی گئی ہے کہ امام صاحب نے کچھ روپیہ دے کر انکی خفیہ مدد کی تھی۔

ان راویوں کو جب اس خفیہ مدد کا علم ہے تو اموی گورنر امیر یوسف ابن عمر جیسے مدبر کو اس کا علم کیوں نہ ہو سکا، انھوں نے امام صاحب کو اس جرم کی سزا کیوں نہیں دی جب کہ اس وقت ان کی کوئی خاص نمایاں حیثیت بھی نہ تھی جو امیر کو ان کے قتل پر کسی فتنے کا خدشہ ہوتا۔ کیونکہ زید سے اہم اسوقت ان کی شخصیت نہ تھی۔ انھیں جب قتل کر دیا تو امام صاحب کو کیا کر سکتے تھے۔

جس شخص کو تمام امت کے فقہاء کا امام بننا تھا، اگر اس کا کردار ایک معمولی صاحب عزیمت کا سا بھی نہ تھا، کہ جس بات کو حق جانے اس کے لئے جان دے، تو اس کی حیثیت یہ کب رہتی ہے کہ اس کے متعلق امام شافعی

فرمائیں" الناس عیال لابی حنیفۃ فی الفقہ (لوگ فقہ میں ابوحنیفہ کے پروردہ ہیں") جناب زید کے خروج میں حضرت امام کی ہمدردی ان کے ساتھ ہرگز نہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ امام صاحب کا اور ان کے اساتذہ کرام کا کھلا مذہب ہے " لا نری الخروج علی ائمتنا و ولاۃ امورنا (ہم اپنے خلفاء اور اپنے امراء کے خلاف خروج کو ناجائز سمجھتے ہیں) سلطان ابوالمظفر عیسیٰ بن ایوب الملک المعظم نے السہم المصیب فی الرد علی الخطیب میں حضرت امام کا یہ قول نقل کرکے آپ کا مفصل فتوی اس طرح بیان کیا ہے (ص ۷۴، ۸۰، طبع دیوبند۔)

اذا سمع الامام ان قوما یدعون الی الخروج فعلیہ ان یبعث الیھم ویمسکھم حتی یظھروا توبۃ۔ فاذا صار لھم فئۃ یرجعون الیھا، یقتل مقاتلھم ویجھز جریحھم ویقتل اسراھم کما یقتل الکفار

جب امام سنے کہ کچھ لوگ خروج کیطرف دعوت دیتے ہیں تو ان کا عہد ان پر لوٹا دے (یعنی ان کے شہری حقوق منسوخ کردے) اور انھیں قید کرے تاآنکہ وہ توبہ کریں۔ اب اگر ان کا کوئی جتھہ بن گیا ہو جو ان کی حمایت کرے تو انمیں سے جو لوگ مقابلہ پر آئیں انھیں قتل کرے ان کے زخمیوں کو مار ڈالے اور ان میں سے جو گرفتار ہو جائیں انھیں ایسے ہی قتل کرے جیسے کافروں کو مارا جاتا ہے۔

پھر سلطان موصوف فرماتے ہیں۔

فمن یکون ھذا رایہ کیف یری الخروج علی الائمۃ قال اللہ تعالی وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ

ترجمہ: جس شخص کی رائے یہ ہو وہ خلفاء کے خلاف خروج کو کس طرح جائز سمجھ سکتا ہے؟ اللہ تعالی فرماتا ہے۔

خیانۃً فانبذ الیھم علی سواء ان اللہ لا یحب الخائنین" وقال لا یمضی قضاء قاضی اھل البغی ولا تقبل شھادتھم

"اگر تمہیں کسی گروہ کی طرف سے خیانت کا خطرہ ہو تو ان کا عہد ویسے ہی ان پر پھینک مارو۔ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔" پھر حضرت امام فرماتے ہیں کہ باغیوں کے قاضی کا فیصلہ نا قابل تنفید ہے اور ان کے گواہوں کی گواہی نا قابل قبول۔

یعنی باغیوں کے تسلط کے زمانہ میں جو عدالتی فیصلے ہوئے ہوں، وہ کالعدم قرار دئے جائیں گے اور ان کی سماعت دوبارہ ہو گی۔

سلطان ابو المظفر الملک المعظم سلطان غازی صلاح الدین ایوبی کے بھائی تھے، ان کا گھرانا شافعی تھا مگر یہ خود حنفی تھے اور اپنی عقیدت و محبت میں اتنے شدید کہ سوائے امام اعظم کے اور کسی کا قول نہیں لیتے تھے۔ یعنی نہ صاحبین کا اور نہ ان کے تلامذہ میں سے کسی اور کا خطیب بغدادیؒ نے تاریخ بغداد میں امام اعظم کے متعلق بہت واہی روایتیں لکھدی ہیں۔ الملک المعظم نے السہم المصیب میں ان پر سخت تنقید کی ہے۔ یہ رسالہ مصر و ہندوستان سے شائع ہو چکا ہے۔ ہمارے سامنے دیوبند کا مطبوعہ رسالہ ہے، سلطان موصوف نے جب یہ رسالہ لکھا تو اسوقت آپ نصاریٰ سے برسر پیکار تھے اور نابلس کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ استحضار علمی اور طمانیت قلب کی یہ شان تھی کہ اسی عالم میں یہ رسالہ لکھا۔ حالانکہ کتابیں ساتھ نہ تھیں جیسا کہ خود اس رسالے میں بیان کیا ہے، ایسے جامع الصفات ہوا کرتے تھے، ہمارے حکمراں۔ جبھی تو اس دنیا کو نور و حکمت سے بھر دیا اور تہذیب و تمدن کے اس درجے تک امت کو پہونچا دیا کہ اہل عالم کے لئے نمونہ تھی۔

خلفاء اسلام کے خلاف خروج کے بارے میں سلطان موصوف نے امام صاحب کا فتویٰ نقل کیا ہے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ خلیفہ و امام جماعت کے خلاف کھڑے ہونے والے کسی شخص سے امام ابو حنیفہؒ کو ہمدردی ہونے کا کوئی امکان نہ تھا۔ یہ فتویٰ کتاب و سنت کے صریح نصوص پر مبنی ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ہے۔

من خلع یداً من طاعۃ لقی	جس نے خلیفۂ وقت کی بیعت سے ہاتھ کھینچا
اللہ یوم القیمۃ لاحجۃ لہ و	وہ اللہ تعالیٰ کے حضور ایسے جائیگا کہ اس
من مات ولیس فی عنقہ	کے پاس کوئی حجت نہ ہوگی اور جو شخص
بیعۃ مات میتۃ جاھلیۃ	ایسی حالت میں مرا کہ (خلیفۂ اسلام کی)

بیعت اس کی گردن میں نہ ہو۔ تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔

فقہ کے چاروں ائمہ اس بارے میں متفق ہیں، اور احکام خداوندی کے مطابق ان کا فتویٰ ایک ہی ہے "حیات احمد بن حنبل" سے حضرت امام احمدؒ کا وہ فتویٰ یہاں نقل کیا جاتا ہے جس کی روایت امام جوزیؒ نے کی ہے۔ جو اختر روایت میں انتہا درجے کے سخت تھے۔ وہ فتویٰ یہ ہے:-

"امام وقت اور خلیفہ قائم کی اطاعت واجب ہے، خواہ وہ فاسق و فاجر ہو یا نیکو کار اور پرہیز گار۔ وہ جب مسند خلافت پر اس طرح متمکن ہو کہ لوگ اس کی امامت پر جمع ہو گئے ہوں اور اس سے راضی ہوں، یا وہ بزور شمشیر خلیفہ بنا ہو اور سب لوگ اسے امیر المومنین کہتے لگے ہوں تو کسی شخص کے لئے جائز نہیں کہ وہ ان ائمہ و خلفاء پر طعن کرے۔ ...... جس شخص نے ایسے امام المسلمین کے خلاف خروج کیا جس پر لوگ اجماع

کر چکے ہوں اور اس کی خلافت مانتے ہوں، خواہ یہ اقرار برضا و رغبت ہو یا بجبر و اکراہ تو اس (خروج کرنے والے) نے مسلمانوں کی قوت کو پارہ پارہ کر دیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار کے خلاف کیا۔ اور اگر وہ اس خروج کی حالت میں مر گیا تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہو گی۔"

چنانچہ یہی ارشاد نبوی ہے (صحیح مسلم، ج ۲ ص ۱۳۶، طبع مصر)

عن زیاد بن علاقة قال سمعت عرفجة قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ستکون هنات وهنات فمن اراد ان یفرق امر هذه الامة وهی جمیع فاقتلوه کائناً من کان۔

حضرت زیاد بن علاقہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں میں نے (حضرت) عرفجہ رض کو فرماتے سنا، وہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ عنقریب فتنے پر فتنہ برپا ہو گا تو جو شخص امت کا کلمہ متفرق کرنا چاہے اس حالت میں کہ امت متفق ہو چکی ہو تو ایسے شخص کو قتل کر دو اگرچہ وہ کوئی ہو

یہ ہے اللہ کی کتاب، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع اور ائمہ اربعہ کا متفق علیہ فتویٰ۔ تو ایسی صورت میں اس کا قطعاً امکان نہ تھا کہ امام اعظم کو جناب زید یا بعد میں خروج کرنے والے شخص سے شمہ برابر بھی ہمدردی ہو، یا وہ اس خروج و بغاوت کو کسی درجے میں جائز سمجھتے ہوں چہ جائیکہ اسے جہاد کہیں اور غزوہ بدر کے مماثل بتا کر (معاذ اللہ) زندقہ و الحاد میں مبتلا ہوں۔

جناب زید کا شمار علماء بنی ہاشم میں ہے۔ واصل بن عطاء کے شاگرد تھے اس لئے رجحان اعتزال کی طرف تھا۔ ان کے متبع انھیں امام کہتے ہیں اور ان کی

اس فقہ پر اپنے علم وعمل کی بنیاد رکھتے ہیں۔ لیکن ان کے ہاں امام کا مفہوم وہ نہیں جو اثنا عشریہ کے ہاں ہے۔ نہ وہ انھیں خدا کی طرف سے مقرر شدہ کہتے ہیں اور نہ معصوم جانتے ہیں۔ ان کے ہاں امامت کا مفہوم دینی اور سیاسی سربراہی سے ہے۔ ان کے گروہ کی حیثیت پھر بھی جماعت کے مقابلے میں ایک فرقے کی سی ہو گئی اگرچہ وہ اپنے عقائد واعمال میں جماعت سے بہت قریب ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ضعیف اور بعض بے پایہ احادیث جو انھیں اپنے ان زیدی ائمہ سے ملیں انہی پر ان کا مدار ہے اگر جناب زید نے دوست دشمن کی تمیز کی ہوتی، غدار کوفی سبائیوں کے بہکائے میں نہ آتے اپنے والد با جد اور برادر بزرگ کے طریقے پر چلتے اور عدالتی فیصلے خوشدلی سے قبول کر لیتے تو یہ زیدی فرقہ نہ بنتا۔ زیادہ سے زیادہ حنفی شافعی مذہبوں کی طرح ان کا بھی ایک فقہی مکتبۂ فکر بن جاتا اور ان کا شمار علمائے سنت میں ہوتا یعنی ان کے خروج کے سبب ان کے فرقے میں جو بندہانہ خیالات آ گئے اور جماعت کے مسلک سے وہ یک گونہ باہر ہو گئے، یہ بات نہ ہوتی علم تاریخ اور علم سیاست کا غیر جانبدار طالب علم ان کے اقدام کو کسی طرح تعمیری نہیں کہہ سکتا۔ علامہ شبلیؒ نے بھی دبے الفاظ میں یہی خیال ظاہر کیا ہے۔ امت کے متفق علیہ خلیفہ اور عظیم الشان امام ہشام امیر المومنین کے متعلق ان کا مخصوص گستاخانہ لہجہ اپنی جگہ ہے (سیرۃ النعمان ص۔ ۴۔ طبع دیوبند) فرماتے ہیں۔

"جس قدر تاریخیں اور رجال کی کتابیں ہمارے سامنے ہیں ان میں کہیں اس کا ذکر نہیں، حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو ایک قابل ذکر واقعہ تھا (یعنی امام ابو حنیفہؒ کا جناب زید کی مدد کرنا۔ ع)

لیکن اس کی سلطنت نہایت امن و امان کی سلطنت تھی ملک میں ہر طرف امن و امان کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ رعایا عموماً رضامند تھی۔ بیت المال میں ناجائز آمدنیاں نہیں داخل ہو سکتی تھیں۔ اس حالت میں امام ابوحنیفہؒ کی مخالفت کی کوئی وجہ نہ تھی"

لوگوں نے جو یہ ہوا باندھی ہے کہ اہل کوفہ میں سے اٹھارہ ہزار آدمیوں نے جناب زید سے بیعت کر لی تھی۔ اور ایک لاکھ آدمی ساتھ دینے کو تیار تھے۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں اور نہ اس کا امکان تھا۔ اوّل تو اس لئے کہ امیر یوسف بن عمر جیسے جہاں دیدہ اور بیدار مغز والی کی نگاہ سے اختلال کی یہ صورت پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی۔ اور دوسرے صراحتاً جو بات سامنے آئی وہ یہ تھی کہ دو سو سے زیادہ آدمی جناب زید کے ساتھ نہ تھے۔ فوج سے ان کا کوئی باقاعدہ مقابلہ نہیں ہوا۔ معمولی شورش تھی جو اچانک نمودار ہوئی اور زید کے کام آجانے پر ختم ہو گئی۔

۲ نتیجہ۔ امام اعظمؒ نے باغیوں کے متعلق جو فتویٰ دیا ہے، وہ بظاہر بہت سخت معلوم ہوتا ہے، کیونکہ کافروں اور معمولی باغیوں کے ساتھ مسلمانوں کا یہ طرز عمل کبھی نہیں رہا کہ زخمیوں اور اسیروں کو قتل کر دیا جائے تاریخ اس پر شاہد ہے اور اس کی مثالیں دینے کی چنداں ضرورت نہیں۔ کیونکہ یہ امر بدیہی ہے، ہمارے خلفاء اور ان کے تحت وہ سلاطین جو اسلام کے نمایندے تھے۔ انھوں نے نہ کبھی کسی بستی میں قتل عام کرایا، نہ اسیران جنگ کو لازماً قتل کیا اور نہ زخمیوں کو مرنے کے لئے چھوڑ دیا۔ انھوں نے کسی بستی کو یا کھیتوں کو یا باغوں کو کبھی نہیں اجاڑا۔ اور نہ مواشی کو ضائع کیا۔

لیکن امام اعظم رح رہتے تھے کوفے میں اور انھیں سبائی عزائم معلوم تھے یعنی یہ کہ ان کا مقصد محض سیاسی اختلال پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ نفس دین کو غارت کرنا چاہتے ہیں اس لئے آپ نے یہ سخت فتویٰ دیا۔ اور یہ فرق ہمیں حضرت علی رض کے عمل سے بخوبی معلوم ہو جاتا۔ اصحاب جمل و صفین سے آپ نے قتال کیا۔ جس کی نوبت سبائیوں کی تخریبی کارروائیوں کے سبب آئی۔ لیکن جمل میں فتح پانے کے بعد آپ نے اعلان کر دیا کہ نہ کسی فرار ہونے والے کا پیچھا کیا جائے اور نہ کسی زخمی کو مارا جائے (امام شافعیؒ الام، ج ۴، ص ۲۱۶ طبع مصر) ان کا مال بھی نہیں لوٹا گیا۔ مورخوں کے بیان کے مطابق ان کا جو مال سبائیوں نے لوٹ لیا تھا وہ سب ان سے لے کر بصرے کی جامع مسجد میں جمع کرا دیا کہ جس کا ہو لے جائے۔ اسی طرح صفین میں ایک اسیر آپ کے پاس لایا گیا تو آپ نے اسے رہا کر دیا۔ اور فرمایا "میں اللہ سے ڈرتا ہوں۔ میں تمہیں قتل نہیں کرونگا (ہمیں کتاب ص ۲۲۴)

امام اعظم رح کے سامنے خروج کرنے والے سبائی تھے۔ جن کے عزائم کی زد میں نفس دین تھا، اس لئے آپ کا فتویٰ اتنا سخت ہے۔ مگر یاد رکھنا چاہئے کہ خود امیر المؤمنین ہشام نے یہ شورش رفع کرنے کے لئے امیر کوفہ کو جو فرمان بھیجا تھا وہ بہت نرم تھا۔ یعنی حسب بیان طبری آپ کے احکام خلاصہ یہ ہے

> "میں نے دیکھا کہ زید ایک جھگڑالو، چرب زبان اور تقریر میں رنگ آمیزی کرنے والے شخص ہیں۔ انھیں کوفے میں ٹھہرنے نہ دیا جائے۔ کیونکہ لوگوں کو گمراہ کر دیں گے، انھیں نکال دو کہ سب کی سلامتی رہے اور کسی کا خون نہ بہے۔ میں تفرقے کے مقابلے میں امن پسند کرتا ہوں۔ جماعت اللہ کی مضبوط

رسی ہوتی ہے۔

اور اگر تم سے ان کا تصادم ہی ہو جائے تو تم کو اللہ کی مدد اس وقت ملے گی جب تم اول اپنی حجت پوری کر دو گے۔ جنگ کے بعد ان لوگوں کے اہل و عیال سے کچھ تعرض نہ کرنا۔ اور فوج کو حکم دینا کہ ان کے گھروں میں داخل نہ ہونے پائے، امیر المؤمنین کا طرزِ عمل اپنی قوم کو مہالک سے بچانے، راہِ راست پر لانے اور سیدھے راستے پر چلانے میں شفیق والد کی طرح ہے۔ جو اپنی اولاد کو ہر خطرے سے محفوظ کرنا چاہتا ہے۔

اس فرمان کا نتیجہ تھا کہ معمولی جھڑپ کے علاوہ کچھ نہ ہوا۔ جناب زید کا سر کٹوانا۔ جثہ سولی پر لٹکانا۔ اس پر تازیانے برسانا، اور پھر ایک گڑھے میں پھینک دینا وہ خرافات ہیں جو ذہنوں کو ماؤف کرنے کے لئے سبائی راویوں نے وضع کر کے "زید شہید" کا لقب دیا ہے۔ جناب زید سے امیر المؤمنین ہشام کے گوناگوں نسبی اور نسبتی رشتے تھے۔ ایسی صورت میں ان راویوں کی مکروہ باتیں ہرگز قابلِ اعتناء نہیں۔ اگر ایسے قریب ترین رشتے نہ ہوتے تب بھی ان بہیمانہ حرکتوں کا امکان نہ تھا، جو تمام بنو ہاشم کو امیر المؤمنین سے برگشتہ کر دیں۔ اور عام مسلمان بھی برافروختہ ہو جائیں زید کے اس سانحے پر عالمِ اسلام میں کوئی ہیجان نہ ہونا اس کی بیّن دلیل ہے کہ ہم عصر امت کے نزدیک کوئی کام شریعت اور اخلاق فاضلہ کے خلاف نہیں ہوا۔ اور اس کی بھی دلیل ہے کہ جناب زید کے خروج کو جائز نہیں سمجھا گیا۔ چہ جائیکہ حضرت امام اعظمؒ کی ہمدردی ان کے ناجائز فعل سے۔

امام ابو حنیفہ اور امیر ابن ہبیرہ ۔ امیر یزید بن عمر جو ابن ہبیرہ کے نام

سے مشہور رہیں، اموی عہد کے آخری والی کوفہ تھے، جنھیں امیر العراقین کہا گیا انہی کے زمانے میں انقلاب آیا اور خلافت عباسیہ قائم ہوئی۔ ولی عہد خلافت حضرت ابوجعفر المنصور عباسیؒ نے انھیں امان دی تھی۔ لیکن ابو مسلم خراسانی جو عربوں کا سخت دشمن تھا۔ اس نے اپنے تمرد اور سرکشی کے سبب یہ امان منسوخ کردی اور امیر ابن ہبیرہ پر یہ الزام رکھ کر کہ وہ عباسیوں کے بجائے علویوں کی خلافت کے خواہاں ہیں۔ انھیں شہید کرادیا۔ امیر المؤمنین المنصورؒ جب خود سریر آرائے خلافت ہوئے تو جن وجوہ کی بنا پر ابو مسلم کو قتل کیا گیا ان میں علاوہ دوسری سخت تریاتوں کے امیر ابن ہبیرہ کا خون ناحق بھی تھا۔

بہرحال چونکہ عراق میں عباسیوں کے داعیوں کا زور بڑھ رہا تھا۔ اور حالات سے انتشار و اختلال کے خطرات اموی حکومت میں پیدا ہو رہے تھے، اس لئے امام ابو حنیفہؒ حجاز چلے گئے۔ اور فتنہ فرد ہونے تک وہیں رہے۔ آپ مکے سے کوفے اس وقت آئے جب خلافت عباسیہ قائم ہوگئی۔ حضرت امام کا اس طرح کوفہ چھوڑ دینا، لوگوں کے لئے بہانہ بن گیا۔ اور ایسی ایسی روایتیں وضع کیں جن کا بطلان عیاں ہے۔ تعجب ان مناقب نویسوں پر ہوتا ہے جنھوں نے عرصہ دراز کے بعد یہ مفتریات اپنی کتابوں میں بھر دیں اور اس بیّن تضاد کا بھی خیال نہیں کیا جو ایسی ہر روایت میں عیاناً موجود ہے۔ اور نہ یہ دیکھا کہ جس امام کی وہ بات کر رہے ہیں اس کے اپنے مواقف کیا ہیں۔ اور اس نے کن امور کی تعلیم دی ہے۔

کبھی آپ کی علمی قابلیت دکھانے کے لئے کہتے ہیں کہ خوارج یعنی اس وقت کے سیاسی ہنگامہ آرائی کرنے والوں کی اصلاح کے لئے امیر ابن ہبیرہؒ نے امام ابن ابی لیلےؒ اور قاضی ابن شبرمہؒ سے ایک رسالہ لکھوایا

لیکن عرصہ دراز کے بعد وہ جو کچھ لکھ کر لائے اسے امیر نے پسند نہیں کیا۔ کسی شخص نے کہا یہاں کوفے میں ایک صاحب ہیں ابو حنیفہ نعمان بن ثابت، وہ ایسا رسالہ لکھ سکیں گے۔ امیر نے آپ کو طلب کر کے ان دونوں صاحبوں کا نوشتہ دکھایا، تو امام نے فرمایا اس میں اللہ اور رسول کے علاوہ سب غلط ہے۔ پھر قلم برداشتہ ایسا مقالہ لکھ دیا جو امیر کو پسند آ گیا۔ گویا جو شخص خاص کوفے میں امام حمادؒ کی مسند پر بیٹھا ہے اور اس کا وہاں عظیم الشان حلقۂ درس ہے اسے امیر جانتے نہ تھے اور اس کے تعارف کی ضرورت تھی۔ راوی کا مقصد محض قاضی ابن ابی لیلیٰؒ اور قاضی ابن شبرمہؒ کی تنقیص ہے کہ وہ ایک معمولی رسالہ بھی نہ لکھ سکے۔ پھر راوی یہ بھی کہتا ہے کہ امام صاحب شورش پسند دل نالاں تھے اور حکومت قائمہ سے وفاداری ایسی ضروری جانتے تھے کہ فوراً اسکی تائید میں ایک مسکت رسالہ لکھ دیا۔

اب دوسری روایت کے مطابق اموی حکومت کے امیر نے سیاسی اختلال کے سبب چاہا کہ ایک "محب اہل بیت" عالم کو اپنے ساتھ ملا کر اپنی حکومت مضبوط کریں۔ چنانچہ امام صاحب کو قاضی بنانا چاہا، اور بعض کے نزدیک اینٹیں گنتے کا کام ان کے سپرد کرنا چاہا تو امام صاحب نے "مخالف حکومت ہونے کے سبب" انکار کر دیا۔ اس پر امیر نے انھیں قید کر کے روزانہ کوڑے لگوائے، تا آنکہ علماء و فقہاء نے آکر فریاد کی کہ اگر اس شخص کو رہا نہ کیا گیا تو یہ مر جائیگا۔ امیر نے کہا کوئی آدمی اسے سمجھائے کہ مجھ سے کچھ مہلت لے تاکہ میں اسے چھوڑ دوں، امام نے مہلت مانگی جو دیدی گئی تو چپکے سے نکل فرار ہو گئے۔ یعنی یا تو حالت اتنی سقیم تھی کہ مرنے کے قریب ہو گئے تھے یا اچانک اتنی طاقت آ گئی کہ اونٹ پر بیٹھ کر سیکڑوں میل کا سفر کر ڈالا۔ پھر ایک طرف

حکومت کے ایسے وفادار تھے کہ جھٹ اس کی حمایت میں رسالہ لکھدیا، یا ایسے مخالف ہوگئے کہ حکومت کا عہدہ قبول کرنے کی بجائے قید و بند اور کوڑوں کی سزا کو ترجیح دی۔

ایک طرف آپ کا یہ مقام بتایا جاتا ہے کہ اموی حکومت کا ساتھ دیتے تو کوفے میں امن ہو جاتا۔ اور آپ کے ذریعہ اختلال سے نجات ملتی یعنی شہر میں آپ کی ایسی اہمیت تھی کہ امیر آپ کی اعانت کے محتاج تھے، اور دوسری طرف کہا جاتا ہے کہ آپ اتنے بے حیثیت تھے کہ قید میں رہے کوڑے کھائے اور اہل شہر نے اس کی پرواہ بھی نہ کی اور سب ایسے ہو گئے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں رہا۔ یعنی امام کی شہرت اور مقبولیت بھی ہے اور لوگوں کی ان سے بے تعلقی بھی۔ وہ ایک طرف محب اہل بیت ہیں کہ عباسی داعیوں کو رام کر سکیں اور حکومت کے ایسے طرفدار بھی کہ عباسی داعیوں سے برگشتہ کرنے کے لئے رسالہ بھی لکھدیں۔

یہ سب متضاد اور بے پا در ہوا باتیں محض یہ بہتان رکھنے کے لئے وضع کی گئیں کہ امام صاحب کو خلافت قائمہ کا مخالف ثابت کریں یعنی امویوں کا جن کی حکومت قائم تھی اور عباسیوں کا بھی جن کی حکومت قائم ہونے والی تھی حالانکہ سیدھی سچی بات یہ ہے کہ آپ چونکہ خالص علمی آدمی تھے اور غیر سیاسی زندگی کے خوگر۔ اس لئے عراق کی مکدر فضا دیکھ کر مکہ معظمہ چلے گئے[1] حالانکہ

---

[1] حجاز کے متعلق حضرت محمد الامام عباسیؒ کا حکم تھا کہ عباسی داعی وہاں کچھ کام نہ کریں تاکہ حرمین شریفین میں اختلال کی کوئی صورت پیدا نہ ہونے پائے اور کامل امن ہو جائے۔ پر قبضہ سب سے آخر میں کیا گیا اور قبضہ بغیر کسی خونریزی کے ہو گیا کیونکہ عباسی امامت پر امت متحد ہو چکی تھی

نہ امیر اور ان کے درمیان کوئی مخالفت تھی اور نہ عباسی داعیوں سے کوئی ربط یا اختلاط
تھا۔ رسالہ لکھواتے، قاضی بنانے کی پیش کش کرنے اور نہ ملنے پر قید و بند
کی مصیبت میں مبتلا کرنے کی سب داستانیں بے حقیقت ہیں۔ ان روایتوں
تضاد ہی ان کے کذب و زور ہونے کی بین دلیل ہے۔

پھر کہا جاتا ہے کہ قاضی ابن ابی لیلیٰ اور قاضی ابن شبرمہ نے امام
صاحب کو سمجھایا تھا کہ جس طرح ہم نے امیر کے مجبور کرنے پر حکومت کے مناصب
قبول کر لئے ہیں۔ اسی طرح آپ بھی ظلم و تشدد سے بچنے کے لئے امیر کی بات مان لیجئے
اس پر امام نے فرمایا در یہ شخص اگر مجھ سے واسط کی مسجد کے ستون گننے کو کہے
گا۔ تب بھی میں اس کی بات نہیں مانوں گا۔ یعنی میں تو کوفے میں اور ذکر کر
ہیں واسط کی مسجد کا جیسے کوفے کی کسی مسجد میں ستون ہی نہ تھے۔

حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ قاضی ابن ابی لیلیٰ اور قاضی ابن شبرمہ امیر
ہبیرہ کی ولایت سے بھی پہلے سے محکمہ قضاء سے وابستہ چلے آتے تھے
کچھ جبر تھا اور نہ تقیہ۔ بلکہ قواعد دینیہ کے تحت خلافت قائمہ سے وا
ضروری سمجھنے کی وجہ سے یہ حضرات مناصب پر فائز ہوئے اور عملا
روحانی فرائض ادا کرنے کے سبب عملی سیاست سے ہمیشہ کنارہ کش رہے تاکہ اگر کوئی سیاسی فتنہ اٹھے
عوام کے حقوق محفوظ رہیں اور نااہل لوگوں کا تصرف عدلیہ پر نہ ہو سکے اور سیاسی اختلال
قانون کی حکمرانی پر کچھ برا اثر نہ پڑنے پائے، چونکہ ہر اسلامی حکومت میں عدلیہ ایک خودمختار
ہوتا ہے اس لئے حکومت کے رد و بدل سے عدلیہ پر کبھی آنچ نہ آئی۔

طبری نے ۱۲۰ھ کے احوال کے تحت صراحت کی ہے "وعلی قضاء الکوفۃ ابن شبرمۃ"
(کوفے کے قاضی ابن شبرمہ تھے) پھر ۱۲۱ھ کی تحت کہتے ہیں "وعلی قضاء الکوفۃ ابن شبرمۃ"
(کوفے کے قاضی ابن شبرمہ تھے) اسکے بعد ۱۲۲ھ کے احوال میں بتاتے ہیں "قاضی الکوفۃ

(ناصر السنۃ محمد بن عبد الرحمٰن بن ابی لیلیٰ (اس سال کوفے کے قاضی محمد بن عبدالرحمان بن ابی لیلے تھے)" یہاں سے یہ بھی عیاں ہوا کہ جناب زید کے خروج کے وقت یہ دونوں بزرگوار کوفے میں موجود تھے اور انھوں نے اس ہنگامے سے کوئی دلچسپی نہیں لی۔

امام ابن قتیبہؒ نے صراحت کی ہے (المعارف ص ۲۱۶)

کان محمد بن عبد الرحمٰن	محمد بن عبدالرحمان بن ابی لیلی بنو امیہ
بن ابی لیلیٰ ولی القضاء لبنی	کے زمانہ میں عہدۂ قضاء پر فائز رہے
امیۃ ثم ولیہ لبنی العباس	پھر اسی عہدے پر بنو عباس کی زمانہ
وکان فقیھًا مفتیا بالرای	میں بھی رہے۔ وہ فقیہ تھے اور

اجتہاد سے فتویٰ دیتے تھے (یعنی امام اعظم ابو حنیفہ اور ان کا مذہب ایک تھا)

ہمارے علماء و فقہاء کا یہ دستور تھا جیسا کہ بیان ہوا کہ وہ غیر سیاسی زندگی بسر کرتے تھے اور جانتے تھے کہ قواعد شرعیہ کے مطابق امام جماعت سے وابستگی اور اس کے ساتھ تعاون لازم ہے۔ جن حضرات نے کسی عذر کے سبب اپنی کمزوری دیکھ کر حکومت قائمہ کا عہدہ قبول نہیں کیا یا اپنی علمی شان کے خلاف جانا یا دنیوی مصالح سے بے نیاز رہے اور زاہدانہ زندگی بسر کی وہ بھی سب کے سب بلا استثناء امام جماعت کی بیعت پر استقامت کو فریضۂ ملیہ سمجھتے تھے، ان کا انکار حکومت کی تحقیر یا اس سے بے تعلقی کے سبب تھا اور نہ اس لئے تھا کہ انکی نگاہوں میں خلافت قائمہ کی حیثیت آئینی نہ تھی۔

اس زمانہ میں ہر بالغ شخص امام وقت سے بیعت کرتا تھا۔ چھوٹی سے چھوٹی بستی میں بھی یہ بیعت لی جاتی تھی تاکہ ہر شخص اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو جماعت اور امام سے وابستہ رکھ کر وحدت امت کا تصور دل میں

جاگزین رکھے، محض مرکز کی طرف سے اعلان پر اکتفا نہیں کیا جاتا تھا۔ یہ بیعت
ورسول کی سنت پر لی جاتی تھی اور یہ ناممکن تھا کہ ہمارے علماء و فقہاء
جو بیعت خدا ورسول کے نام پر کریں وہ رسمی ہو اور منافقت سے اللہ
اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ان کی زبان پر آئے۔

خلافت قائمہ اور علماء و فقہاء امت کے مابین دوئی یا حریفانہ
ثابت کرنے کے لئے جتنی روایتیں وضع کی گئی ہیں وہ سب ملت اسلام
اندرونی دشمنوں کی ساختہ پرداختہ ہیں اور بے احتیاط لوگوں نے ا
اپنی کتابوں میں درج کر دیا، کبھی عدم مبالاۃ کے سبب اور کبھی بالقصد
مقاصد کے تحت تا کہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سیاسی
اپنے اجماع سے قائم کیا تھا اس کی حجت مسلم نہ رہے۔

انسانی معاشرے میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں خصوصاً جب وہ م
اتنا وسیع ہو کہ اس کی پہنائی میں کئی برّاعظم ہوں تو علماء و فقہا کا ایک گروہ
رہنا چاہیئے جو حکومت کے مناصب سے الگ رہے تا کہ ہر قسم کے لوگ ا
بے تکلف استفادہ کر سکیں اور یوں امت میں اصلاح اور یک جہتی کی
قائم رکھنے کی سبیل ہمیشہ کھلی رہے۔ اسی لئے ہمارے بہت سے اک
اپنے آپ کو حکومت کے مناصب سے الگ رکھا۔

اور چونکہ علماء و فقہاء کا یہ بھی فرض ہے کہ امت کو غلط روی
رکھیں اور قانون کی حکمرانی پر حرف نہ آنے دیں اس لئے بہ کثرت حضرات
حکومت کے مناصب لئے اور امت نے ان دونوں طبقوں سے پورا فائدہ
یوں ثقافت اسلامیہ اس سنام اعلیٰ تک پہنچی جس نے اہل عالم کو
کر دیا۔

ام ابو حنیفہؒ اور امیر حسن بن قحطبہ

۱۳۲-۱۳۳ھ میں انقلاب حکومت کے بعد امام اعظم ابو حنیفہؒ
سے کوفے تشریف لائے، اور ۱۴۵ھ تک اپنے تدریسی اور تجارتی مشاغل
صروف رہے۔ پھر اسی سال دار الخلافہ کی تعمیر کے سلسلے میں بغداد تشریف
لے۔ سنہ ۱۵۰ھ تک قیام وہیں رہا۔ اسی سال آپ نے وفات پائی اور
ادہ خلافت کے قبرستان میں دفن ہوئے جو بعد میں مقابر خیزرانؒ کے
سے مشہور ہوا۔

بہر حال یہ تو تھی امام صاحب کی بات، اب امیر المؤمنین المنصورؒ کے
پہ سالار اور دعوت کے مخلص کارکن امیر حسن بن قحطبہؒ کی بات ملاحظہ ہو
پنے والد ماجد امیر قحطبہؒ کی معیت میں سنہ ۱۳۲ھ سے بھی پہلے سے دور
علاقوں میں خلافت اسلامیہ کی خدمات انجام دے رہے تھے۔ اور
ھ سے لے کر سنہ ۱۶۸ھ تک شام اور آرمینیا کی گوناگوں مہمیں سر کرنے
شغول رہے۔ لیکن ہم یہاں اس وضعی داستان پر توجہ کرتے ہیں۔
م ابو حنیفہؒ اور امیر حسن بن قحطبہ کی بابت بڑی آب و تاب سے بیان کی
ہے اور بعض مدعیان تحقیق نے اسے اہمیت دی ہے، خلاصہ یہ ہے۔

> ؒ امیر المؤمنین) المنصور کے مظالم میں ان کا ساتھ دے کر حسن
> بن قحطبہ نے جو گناہ سمیٹے تھے۔ ان کا بوجھ اپنے ضمیر پر محسوس
> کرکے انھوں نے امام ابو حنیفہ کے ہاتھ پر توبہ کی۔ لیکن امام
> نے فرمایا کہ تمہیں اپنی توبہ کا حقیقی ثبوت ابھی دینا ہے، چنانچہ
> جب سنہ ۱۴۵ھ میں "نفس زکیہ" (محمد حسنی) کے خلاف المنصو
> نے حسن بن قحطبہ کو لشکر لے جانے کا حکم دیا تو امام ابو حنیفہؒ

نے فرمایا اپنی توبہ کے واقعی ہونے کا ثبوت تمہیں دینے کا وقت اب آیا ہے۔ وہاں جانے سے انکار کر دو۔ اور اس خون ناحق میں اپنے ہاتھ مت رنگو۔ ابن قحطبہ نے ایسا ہی کیا۔ اور قید کر دیے گئے۔

جس شخص نے یہ افسانہ گھڑا ہے، اسے اطمینان تھا کہ تاریخ کے اوراق کون نگاہ ڈالتا ہے اور واقعی وہ اپنے گمان میں سچا تھا کیونکہ لوگ اس افسانہ کو اچھال کر حضرت امام کی شیعیت یا شیعیت کی طرف میلان کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں حتیٰ کہ ہمارے زمانے کے بزعم خویش ایک "بہت بڑے مفکر اسلام" اپنی رسوائے عالم کتاب "خلافت و ملوکیت" میں پوری تفصیل سے اسے حجت بناتے ہیں اور بار بار محمد حسنی کو "نفس زکیہ" کہہ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولا ہے کہ آپ نے محمد حسنی کو ان کے مقتول ہونے سے سوا سو برس پہلے ہی نماز جنازہ پڑھ کر "النفس الزکیہ" فرمایا تھا۔

مگر صحیح صورت حال یہ ہے کہ نہ کبھی امام صاحب اور امیر حسن بن قحطبہ کو نہ انھیں محمد حسنی کے مقابلے پر جانے کا حکم دیا گیا اور نہ اس کا امکان تھا کہ میں امام صاحب کسی سے اس کی توبہ کی واقعیت کا ثبوت طلب کرنے کے لئے محمد حسنی کے مقابلے پر جانے سے روکیں۔ کیونکہ امام صاحب اسوقت بغداد میں نہ کوفے میں اور امیر المؤمنین کے حضور ان کی خدمت انجام دینے میں مشغول تھے نہ کہ ان کے خلاف کسی سیاسی جوڑ توڑ میں اور امیر حسن بن قحطبہ بھی اس وقت بغداد و کوفے سے سیکڑوں میل کے فاصلے پر اپنی خدمات انجام دے رہے تھے۔

محمد حسنی کے خلاف جو فوجی دستہ بھیجا گیا تھا وہ تادیبی مقصد سے تھا جنگ کے لیے نہیں بھیجا گیا تھا، اسی لئے امیر المؤمنین نے اس کی کمان کسی غیر ہاشمی

دی بلکہ اپنے سگے بھتیجے کے سپرد کی اور ہاشمی سادات کا ایک گروہ ان کے ساتھ کر دیا
تاکہ جہاں تک ممکن ہو خون خرابے کی نوبت نہ آئے اور اپنے خاندان کے افراد کے
سمجھانے سے وہ راہِ راست پر آجائیں کسی غیر ہاشمی کی کمان میں یہ دستہ
بھیجنے سے یہ مقصد ہی فوت ہو جاتا۔ اور نہ یہ مہم ہی ایسی تھی کہ امیر حسن بن
قحطبہ کو سیکڑوں میل دور کے علاقے سے طلب کر کے وہاں بھیجنا ضروری ہوتا

طبری کا بیان ہے بذیل وقائع سنہ ۱۴۵–۱۵۰ھ اور اس کی توثیق دوسرے
مورخوں کے علاوہ یاقوت حمویؒ کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ جو انھوں نے
تعمیر بغداد کے سلسلے میں لکھا ہے (معجم البلدان جزء ۴، ص ۴۶، طبع بیروت۔

ان المنصور وجه فی حشر
الصناع والفعلة من الشام
والموصل والجبل والكوفة
وواسط والبصرة فاحضروا
وامر باختيار قوم من ذوي
الفضل والعدالة والفقه و
الامانة والمعرفة بالهندسة
فكان ممن حضر لذلك
الحجاج بن ارطاة وابو حنيفة
النعمان بن ثابت وامر بخط
المدينة وحفر الاساسات
وضرب اللبن وطبخ الاجر
فبدئ ذلك - واول ما ابتدئ

(امیر المومنین) المنصور نے حکم دیا کہ کاریگر
اور مستریوں کو شام، موصل، جبال، کوفہ
واسط اور بصرے سے جمع کیا جائے
چنانچہ یہ لوگ حاضر کر دئے گئے ایسے
لوگوں کو متعین کرنے کا حکم دیا جو اپنی
فضیلت، عدالت، دین کی سمجھ، امانت
اور فن تعمیر میں مہارت رکھتے ہوں۔
چنانچہ جو حضرات حاضر ہوئے انمیں
حجاج بن ارطاۃ اور ابو حنیفہ نعمان
بن ثابت بھی تھے۔ پھر آپ نے شہر کی
داغ بیل ڈالنے، بنیادیں کھودنے
اینٹیں بنانے اور چونا پکانے کا حکم
دیا اور یہ کام شروع کر دیا گیا پہلے پہل

بہ فی عملہا سنۃ ۱۴۵ھ — اس کام کی ابتدا سنہ ۱۴۵ھ میں ہوئی

یعنی جس وقت محمد حسنی اور ان کے بعد ان کے بھائی ابراہیم نے خروج و بغاوت کا اقدام کیا، اس وقت امام صاحب، بارگاہِ خلافت میں حاضر تھے اور تعمیر کے کام کی نگرانی کے علاوہ امیر المؤمنین نے دوسری خدمات بھی ان کے سپرد کردی تھیں، جیسا کہ دوسری جگہ ہم نے بیان کیا ہے۔

اس زمانے میں امیر حسن بن قحطبہ کی بابت حسب ذیل تصریحات ہیں۔

۱- سنہ ۱۳۶ھ میں حسن بن قحطبہ آرمینیا میں متعین تھے اور سنہ ۱۳۷ھ میں امیر المؤمنین کے چچا عبداللہ بن علی السجاد کی بغاوت فرو کرنے کے لئے ابو مسلم خراسانی کا ساتھ دینے موصل آئے اور یہ مہم سر کر کے پھر آرمینیا چلے گئے (طبری ج ۳، ص ۴۷۵، ترجمہ) اسی مہم میں ابو مسلم کی تخریبی اور باغیانہ عزائم کا کچا چٹھا لکھ کر انھوں نے حضرت امیر المؤمنین کی خدمت میں بھیج دیا تھا۔

۲- سنہ ۱۳۸ھ میں جب نصرانی بادشاہ نے شاہ کے علاقوں پر حملہ کیا، تو امیر حسن بن قحطبہ کی مدد کے لئے امیر مؤمنین کے چچا امیر صالح بن علی السجاد اور ان کے بھتیجے امیر عباس بن محمد الامام، ایک فوج گراں لے کر روانہ ہوئے اس جہاد کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں خانوادۂ خلافت کی دو خاتون بھی شریک تھیں۔ یعنی امام علی السجاد کی صاحبزادیاں سیدہ ام عیسٰی اور سیدہ لبابہ رح

۳- سنہ ۱۳۹ھ میں ابراہیم الامام کے فرزند امیر عبدالوہاب عباسی نے امیر حسن بن قحطبہ کے ساتھ دوبارہ رومیوں کے خلاف جہاد کیا۔ (البدایہ والنہایہ، ج ۱۰ ص ۷۴)

۴- سنہ ۱۴۹ھ میں امیر عباس بن محمد الامام کی معیت میں حسن بن قحطبہ نے رومیوں کے خلاف ایک اور جہاد کیا (طبری ج ۴، ص ۳۳۵، ترجمہ)

(۵) امیر المؤمنین محمد المہدی عباسیؒ کے عہد میں جب رومیوں نے اسلامی شہروں پر یلغار کی تو امیر حسن بن قحطبہ نے تیس ہزار باقاعدہ سپاہ اور ہزار رضا کاروں کے ساتھ روم کے خلاف جہاد کیا۔ (طبری ج ۳، ص ۴۷۶)

۶- اسی طرح خود امیر المؤمنین المہدیؒ نے جب ۱۶۳ھ میں ولی عہد خلافت ابو جعفر ہارون الرشیدؒ کو ساتھ لے کر رومیوں کے خلاف جہاد کیا تو دوسرے فوجی افسروں کے ساتھ امیر حسن بن قحطبہ بھی اس لشکر میں تھے۔ (و کان فی ھذا الجیش الحسن بن قحطبہ) البدایہ۔)

غرض یہ ہے کہ نہ محض امیر المؤمنین المنصورؒ کے زمانے میں بلکہ ان کے فرزند کے عہد میں بھی حسن بن قحطبہ ایسے دور کے علاقوں میں اور ایسی مہموں میں مشغول رہے کہ نہ ۱۳۲ھ سے ۱۴۵ھ تک اور نہ ۱۴۵ھ سے ۱۵۰ھ تک اس کا کوئی موقعہ تھا کہ امام ابو حنیفہؒ اور امیر حسن بن قحطبہ یکجا ہوں، اور نہ محمد حسنی کے خروج کے وقت امام صاحب کوفے میں تھے۔ اور نہ حسن بن قحطبہ کبھی قید کیے گئے۔ اگر اللہ کی راہ میں جہاد، خلفاء اسلام کا ظلم تھا اور اس میں شرکت معصیت، تو بیشک امیر حسن بن قحطبہ نے بڑے گناہ کمائے اور ظلم ڈھائے جن سے ان پر توبہ لازم تھی!۔

خدا سمجھے ان اہل قلم سے جو ہماری تاریخ کو اس طرح مسخ کرتے ہیں لیکن یہ کرامت صحابہ کرام اور خلفاء عظام کی ہے کہ ملت کے اندرونی دشمنوں نے جتنی داستانیں وضع کیں ان میں ان جھولوں کو روایت وضع کرنے کے سلیقے سے اللہ تعالیٰ نے محروم رکھا۔ کیونکہ یہ ایسی بے پر کی اڑاتے ہیں کہ تاریخ کے صفحات کا سرسری مطالعہ کرنے والا بھی ہنس پڑے۔

غرضیکہ امام ابو حنیفہؒ پر یہ افترا کہ انھوں نے حکومت کے فوجی افسر کو

عدول حکمی پر ابھارا تھا محض بے بنیاد اور من گھڑت ہے۔

امام ابو حنیفہؒ اور محمد الارقط حسنی

خلافت عباسیہ ۱۳۲ھ میں قائم ہوئی، اندلس کے علاوہ تمام عالم اسلام اس کی بیعت میں داخل ہو گیا۔ امیر المؤمنین المنصور عباسی کو مسند خلافت پر متمکن ہوئے آٹھ برس ہو چکے تھے کہ محمد الارقط بن عبد اللہ بن الحسن بن الحسن بن علیؓ بن ابی طالب نے بغاوت کر دی۔ کہتے ہیں کہ انکے بھائی ابراہیم بھی اس سازش میں شریک تھے۔ پھر کہتے ہیں کہ دونوں نے منصوبہ بنایا تھا کہ مدینہ طیبہ اور بصرے میں بیک وقت خروج کیا جائے۔ ان دونوں نے امیر المؤمنین سے بیعت نہیں کی تھی۔ اور روپوش تھے۔ مگر ان کے اور عزیز ان کے والد عبد اللہ المحض نے امیر المؤمنین السفاحؒ اور امیر المؤمنین المنصورؒ دونوں سے بیعت کی تھی۔ دونوں کے ہاں ان کا احترام تھا اور خصوصی تعلقات تھے، اپنے بیٹوں کی انکار کو وہ غیر اہم بتا کر آیندہ بیعت کے لئے انھیں ہموار کرنے کا اطمینان دلایا کرتے تھے۔ مگر تھیں یہ سب باتیں محض برائے گفتن، وہ پوری طرح اپنے فرزندوں کے عزائم میں ان کے ہم نوا تھے۔

حصول حکومت کی تڑپ ان میں اس وقت پیدا ہوئی جب دعوت عباسیہ کامیاب ہو گئی۔ اور بنو عباس خلافت پر فائز ہو گئے۔ اب انھوں نے بھی یہی ترکیب چلنی چاہی کہ خفیہ خفیہ اپنے ہم نوا پیدا کریں لیکن کام کرنے کا سلیقہ نہ تھا۔ اور امت میں خلافت عباسیہ اتنی مقبول تھی کہ انھیں اپنے حمایتی میسر نہ آسکے۔ امیر المؤمنین المنصورؒ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے اپنی آدمیوں کو ان لوگوں کے پاس اس مقصد سے بھیجا کہ اپنے آپ کو "شیعہ علی" ظاہر کرکے سب معلومات حاصل کریں۔ چنانچہ بقول طبری حجت قائم کرنے کے لئے عقبہ ازدی

کو "شیعہ علی" کی طرف سے ایک نیاز مندانہ خط اور روپیہ دے کر عبداللہ المحض کے پاس بھیجا گیا اور ہدایت کی گئی کہ اپنا اعتبار قائم کر کے انھیں روپیہ دینا اور تحریری جواب بھی لانا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ المحض نے روپیہ لے لیا مگر خط کا جواب لکھنے کے بجائے کہا کہ ہم ان لوگوں کو جانتے نہیں۔ اس لئے تحریر نہیں دے سکتے۔ البتہ ہمارا سلام انھیں پہونچا دینا۔

امیر المؤمنین المنصورؒ جب حج کے موقعہ پر مدینہ طیبہ حاضر ہوئے تمام ہاشمی سادات نے خیر مقدم کی سعادت حاصل کی عبداللہ المحض بھی آئے آپ نے خلیفہ المنصورؒ نے ان کی خوب مدارات کی۔ بعد میں دریافت کیا تم اپنے عہد وفا پر قائم ہو، حکومت کے خلاف کوئی سازش تو نہیں کر رہے ہے؟ انھوں نے جواب دیا بیشک میں اپنے عہد پر قائم ہوں۔ امیر المؤمنین نے عقبہ کو سامنے آنے کا اشارہ کیا، اسے دیکھتے ہی عبداللہ گھبرا گئے۔ دوزانو ہو کر امیر المؤمنین سے معافی کی التجا کی۔ مگر انھیں قید کر دیا گیا اور ان کے ساتھ ان کے دو ایک عزیزوں کو بھی جو اس سازش میں ملوث تھے۔

اب سوچنا چاہیئے کہ ان لوگوں کے عزائم تو تھے انقلاب لا کر علوی حکومت قائم کرنے کے، لیکن جہاں تک اسباب فراہم کرنے، اپنے حق میں رائے عامہ استوار کرنے اور خروج کے لئے موزوں وقت متعین کرنے کا سوال ہے تو اس کی انھوں نے چنداں ضرورت نہیں سمجھی۔ روپیہ اور خط وصول کر لیا اور جن شیعوں کو جانتے تک نہ تھے انھیں سلام بھی کہلوا دیا۔ مگر اس تحقیق کی ضرورت نہ سمجھی کہ وہ شیعہ کہاں ہیں کتنے ہیں۔ ان کی وفاداری کس حد تک اطمینان بخش ہے اور ان کے وسائل سے انقلابی ضرورتیں پوری ہو سکتی ہیں یا نہیں

یہ لوگ اس خیالی دنیا میں رہ کر خروج کر بیٹھے۔ برخلاف ان کے

دعوت عباسیہ نے تینتیس تیس برس کی ہمہ گیر کوششوں کے بعد تمام عالم اسلام کی حمایت حاصل کر کے دو براعظموں پر اپنا پرچم لہرایا۔ کہاں دعوت عباسیہ ایک عوامی تحریک، اور اس کی ہمہ گیر کامیابی اور کہاں محمد بن عبداللہ حسنی الملقب بہ الارقط کے دعوے کی محض یہ بنیاد کہ "مجھے ہاشم نے دو دفعہ جنا ہے، عبدالمطلب نے دو دفعہ جنا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو دفعہ جنا ہے اور حضرت علی نے دو دفعہ جنا ہے اور میں اس کا بیٹا ہوں جو سب سے پہلے ایمان لایا (یعنی ان کے خیال میں حضرت علیؓ) اور میں اس کا پوتا ہوں جس پر سب سے کم عذاب ہے یعنی ابوطالب"۔ اس نسلی اور شخصی فضیلت جتانے کو انھوں نے خلافت کی اہلیت قرار دیا۔ اگر یہ دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ امت بھی ان تعلّیوں پر کان دھرتی ہے یا نہیں۔ حصول حکومت کے لئے جو سب سے اہم بلکہ واحد شرط ہے یعنی رائے عامہ کی اپنے حق میں استواری اس کی طرف سے یہ لوگ ہمیشہ غافل رہے۔ اس لئے پیہم و متواتر ناکامی اور نامرادی ان کا مقدر رہی۔

محمد حسنی ملقب بہ الارقط نے جنہیں سبائیہ نے "نفس الزکیہ" کا خطاب دے رکھا ہے اور خود انھوں نے اپنے کو "مہدی" بھی کہلوایا تھا۔ علم سیاست اور آدابِ جنگ سے قطعاً بے نیاز ہونے کا ثبوت یہ دیا کہ ان کے خیال میں ان کے شیعوں کی موہوم ہستیاں تو تھیں بلاد عجم میں اور بغاوت کا جھنڈا بلند کر بیٹھے، مدینہ طیبہ میں۔ حالانکہ اہل مدینہ کی بھاری اکثریت ان کے خلاف تھی۔ کچھ لوگ جو ان کے ساتھ ہو گئے تھے وہ اتنے بھی نہ تھے کہ دو چار گھنٹے ہی عسکر خلافت کا مقابلہ کر سکیں۔

امیر المؤمنین المنصورؒ نے یہ فتنہ فرو کرنے کے لئے جو فوجی دستہ مدینہ

طلبیہ بھیجا تھا، اس کی کمان اپنے سگے بھتیجے امیر علیسٰی ابن موسیٰ بن محمد الامام عباسیؒ کے سپرد کی تھی اور یہ اہتمام کیا تھا کہ کوئی ہاشمی گھرانا ایسا نہ رہے جس کے افراد اس دستے میں نہ ہوں۔ ان میں سے طبری وغیرہ کے بیان کردہ چند طالبی حضرات کے نام حسب ذیل ہیں۔

۱۔ قاسم بن حسن بن زید بن حسن بن علی بن ابی طالب

۲۔ عبداللہ بن الحسین الاصغر بن علی بن الحسین بن علی بن ابی طالب

۳۔ عمر بن محمد بن عمر بن علی ابن ابی طالب (۴) عبداللہ بن محمد بن عمر بن علی بن ابی طالب (۵) عبداللہ بن اسماعیل بن عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب (۶) محمد ابو الکرام بن عبداللہ بن علی بن عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب (۷) قاسم بن عبداللہ بن محمد بن عقیل بن ابی طالب (۸) ابو عقیل محمد بن عبداللہ بن محمد بن عقیل بن ابی طالب، وغیرہم ان حضرات میں دلچسپ شرکت امیر محمد عباسی بن امیر المومنین ابو العباس السفاح کی تھی جو اپنی محمد بن الارقط عبداللہ حسنی کے داماد تھے۔

اس دستے کی ترتیب سے غرض یہ تھی کہ اپنے گھر والوں اور قریب ترین عزیزوں کے سمجھانے سے شاید محمد الارقط حسنی راہ راست پر آجائیں۔ تین دن ان حضرات نے امان پیش کی اور باغیوں کو ہر چند سمجھایا کہ اس غلط اور تباہ کن اقدام سے باز رہیں مگر وہ نہ مانے۔ البتہ بعض حضرات ان کا ساتھ چھوڑ کر شہر کو واپس چلے گئے۔ اب بھی وقت تھا کہ اپنی سوء تدبیر اور بے سرو سامانی سے عبرت پکڑیں۔ مگر تیر اندازی شروع کر دی۔ اس پر ان کے ابن عم قاسم بن حسن نے امیر علیسٰی سے کہا کہ حجت پوری ہو گئی اور اب قوت سے جواب دینا چاہیئے۔ چنانچہ رن پڑا اور محمد الارقط بڑی بہادری سے لڑے۔ حتیٰ کہ جب تنہا رہ گئے اور ساتھیوں نے ساتھ چھوڑ دیا تب بھی میدان سے نہ ہٹے

گرفتار ہونے کی بجائے بے جگری سے جان دی۔ عفی اللہ عنہ

ان کی فوج میں بھگدڑ پہلے ہی مچ گئی تھی۔ کیونکہ ادھر ہنگامہ بپا ہوا ادھر سیدہ اسماء بنت حسن بن عبید اللہ بن عبید اللہ ابن عباس نے اپنی سیاہ چادر مسجد نبوی کے منارے پر لہرادی۔ باغی سمجھے کہ شہر پر عسکر خلافت کا قبضہ ہو گیا۔ اور مقاومت فضول ہے۔ بہر حال یہ حادثہ فاجعہ ہوا۔ اور بے وجہ قیمتی جانیں ضائع ہوئیں۔ ان کے قتل کے بعد ان کی ہمشیرہ سیدہ زینب اور صاحبزادی سیدہ فاطمہ نے امیر عیسیٰ کے پاس پیغام بھیجا کہ جو ہونا تھا وہ ہو گیا اب مقتول کی تدفین کی اجازت دی جائے۔ چنانچہ حسب روایت طبری انھیں باحترام جنت البقیع میں سرکاری اہتمام سے دفن کر دیا گیا۔ ان کا سر کاٹنے اور بغداد بھیجنے کی سب روایتیں باطل ہیں۔ امیر المؤمنین نے فوجی دستہ روانہ کرتے وقت اپنے بھتیجے سے فرمایا تھا (طبری نیز البدایہ والنہایہ)

"عیسیٰ! میں تمھیں اپنے پہلوؤں کے درمیان (یا پہچانا نے) بھیج رہا ہوں۔ اس شخص پر اگر قابو پالو۔ تو تلوار میان میں کر کے امان کا اعلان کر دینا"

یعنی ان کی قرابت قریبہ اور شخصی احترام کا خیال رکھنا جہاں تک ممکن ہو خون ریزی سے بچنا۔ اور حرم شریف کی حرمت پر حرف نہ آنے دینا ایسی صورت میں افترا پرداز لوگوں کے اس بیان میں کیا صداقت ہو سکتی ہے کہ ان کا سر کاٹا گیا اور جثہ یہود کے قبرستان میں پھینک دیا گیا۔ ان کے دادا اور بھائی بھتیجوں کی موجودگی میں نہ انکا سر کاٹا جا سکتا تھا اور نہ ان کی لاش کی بے حرمتی کا امکان تھا۔ پھر اس وقت یہود کے مقابر ہی کہاں

تھے۔ ڈیڑھ سو برس پہلے ہی وہ برابر کر دئے گئے تھے اور ان کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ (جامع ترمذی۔ ج ا ص ۱۲۵، باب لتسویۃ القبور طبع مجتبائی دہلی)

عن ابی وائل ان علیا قال لابی الھیاج الاسدی ابعثک علی ما بعثنی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان لا تدع قبرا مشرفا الا سویتہ و لا تمثالا الا طمستہ

حضرت ابو وائلؓ سے مروی ہے کہ حضرت علیؓ نے ابو الہیاج اسدی سے فرمایا، میں تمہیں اسی کام کے لئے بھیجتا ہوں جس کیلئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بھیجا تھا کہ کوئی نمایاں قبر ایسی نہ رہے جسے تم برابر نہ کردو۔ اور نہ کوئی بت ایسا رہے جسے تم مسمار نہ کردو۔

حضرت علیؓ کا مذہب ہی یہ ہے اور خود ان کی قبر کا تو صحیح طور سے کہیں نام و نشان نہیں۔ محمد الارقط حسنی کی لاش کی بابت سب باتیں کربلاء کی داستانوں کی طرح عوام الناس کے جذبات بھڑکانے کے لئے وضع کی گئی ہیں۔ محمد حسنی کی بغاوت کو جہاد کی رفعت دینے کی کوشش بھی اسی لئے کی جاتی ہے۔

ایک اور افتراء شیعی راویوں اور تخریب پسند مصنفوں نے اس وضعی روایت کو بڑی شہرت دی ہے کہ امام مالکؒ نے محمد الارقط بن عبداللہ حسنی کی حمایت میں فتویٰ دیا تھا۔ چنانچہ عمدۃ الطالب کے مصنف کہتے ہیں۔

وکان مالک بن انس الفقیہ قد افتی الناس بالخروج

مالک بن انس فقیہ نے لوگوں کو محمد کے ساتھ ہو کر خروج کا فتویٰ دیا

معہ محمد و بایعہ ولذلک — دیا تھا اور ان سے بیعت کر لی تھی

تغیر المنصور علیہ — اسی لئے المنصور ان سے بگڑ گیا

یہ افترار محض ہے اور امام مالک رح کے کھلے ہوئے مذہب کے بالکل خلا

پھر سوال ہے کہ انھوں نے اگر خروج کا فتویٰ دیا تھا اور بیعت کر لی تھی تو ا

"جہاد" میں شریک کیوں نہیں ہوئے۔ اتنی بڑی بات کہ امت کے متفق علیہ

کی بیعت توڑ دیں اور پھر جس سے بیعت کی ہے اس کا ساتھ بھی نہ دیں، ا

ناشایستہ ہے کہ امام مالک رح جیسے عظیم المرتبت فقیہ کے متعلق سوچی بھی نہیں

وہ تو اپنے مذہب میں اتنے سخت ہیں اور مسلمانوں کے باہمی نزاع سے ا

متنفر کہ ایک شخص نے جب ان سے حضرت عثمان رض اور حضرت علی رض کی بابت

پوچھا کہ ان میں افضل کون ہے؟ تو آپ نے فرمایا "جس شخص نے تلوار ا

(یعنی حضرت علی رض نے) میں اسے اس شخص سے افضل کیسے کہہ سکتا ہوں جس

تلوار نہیں اٹھائی" (یعنی حضرت عثمان ذی النورین نے)

طبری نے بھی اس ضمن میں دو متضاد روایتیں لکھی ہیں (ج ۳ ص

ایک تو یہی جو اوپر گذری ذرا تفصیل کے ساتھ اور دوسری بالکل اسکے خ

اخبرنی غیر واحد ان مالک

ابن انس استفتی فی الخروج — مجھ سے کئی آدمیوں نے بیان کیا

مع محمد وقیل لہ ان فی — کہ مالک ابن انس سے محمد کے سا

اعناقنا بیعۃ لابی جعفر — خروج کی بابت فتویٰ پوچھا گیا

فقال انما بایعتم مکرھین — ان سے کہا گیا کہ ہماری گردنوں

ولیس علی کل مکرہ یمین — ابو جعفر کی بیعت ہے تو انھوں

فاسرع الناس الی محمد و — فرمایا تم سے یہ بیعت زبردستی لی

لزم مالك بيته — اور مجبوری کی حالت میں کسی پر کسی قسم کی ذمہ داری نہیں۔ لہذا لوگ محمد کیطرف دوڑ پڑے اور مالک اپنے گھر میں بیٹھ رہے۔
کن لوگوں نے یہ بیان کیا اور وہ تھے کس حیثیت کے اس کا کچھ ذکر نہیں۔ پھر سوال ہے کہ خود امام مالکؒ نے خلیفہ المنصورؒ سے بیعت خوشی سے کی تھی یا مجبوراً اس کا بھی ذکر نہیں۔ علاوہ ازیں یہ بھی نہیں بتایا گیا کہ اہل مدینہ سے جبراً بیعت لینے کی صورت کیا تھی۔ یعنی ایک ایک آدمی کو گرفتار کر کے لایا جاتا تھا کہ بیعت کرے، اور اس طرح سب بنو ہاشم اور مہاجرین والنصار کی اولاد نے تلوار کے ڈر سے یہ بیعت کی تھی اور آٹھ برس سے اس جبر یہ بیعت پر صابر و شاکر بیٹھے تھے غنیمت و فئ سے حصے بھی لیتے تھے اور دیوانِ فاروقی کے مطابق وظیفہ بھی اور پھر کہتے تھے کہ ہم اس حکومت سے راضی نہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ نہ بیعت جبراً لی گئی تھی، نہ اہل مدینہ کی اکثریت نے بیعت توڑی۔ نہ امام مالکؒ نے ایسا لغو فتویٰ دیا اور اگر دیتے تو گھر میں نہ جا بیٹھتے۔
اب طبری کی دوسری روایت ہے۔ (ص ۱۷۳)

لما حج ابو جعفر ارسل محمد بن عمران بن ابراهيم بن محمد بن طلحه و مالك بن انس الى اصحابنا فسألهم ان يدفعوا اليه محمدًا و ابراهيم ابني عبد الله	جب (امیر المؤمنین) ابو جعفر حج کیلئے آئے تو آپ نے محمد بن عمران بن ابراہیم بن محمد بن طلحہؓ اور امام مالکؒ بن انس کو ہمارے آدمیوں کے پاس بھیجا اور ان سے مطالبہ کیا کہ عبداللہ کے دونوں فرزندوں محمدؒ و ابراہیم کو امیر المؤمنین کے حوالے کر دیں۔

گویا اس روایت کے مطابق امام مالکؒ نے محض یہی نہیں کہ امیر المؤمنین سے بخوشدلی بیعت کی تھی بلکہ وہ ان کے معتمد کارکن بھی تھے اور چاہتے تھے کہ

لوگ اس بیعت کی حرمت کو برقرار رکھ کر باغیوں کو اپنے متفق علیہ امام کے سپرد کر دیں۔ امام مالکؒ کے گھر میں بیٹھ رہنے سے بھی اسی کی توثیق ہوتی ہے کیونکہ عملاً محمد کا ساتھ نہ دینا آپ کے بارے میں متفق علیہ ہے۔

یہ ہے اہل تاریخ کی تضاد بیانی اور حیرت ان پر ہوتی ہے کہ جو روایت واقعات کے مطابق ہو اسے رد کر کے ایسی روایت کو شہرت دیتے ہیں جس کا کوئی عملی ثبوت نہ دے سکیں۔ امام مالکؒ نے اگر فتویٰ دیا ہوتا اور اس کی پذیرائی میں لوگ محمد الارقط حسنی کا ساتھ دینے کے لئے دوڑ پڑتے تو کیا یہ نتیجہ نکلتا جو نکلا کہ دو تین گھنٹے بھی مقابلہ نہ کیا جا سکا۔ لہذا ناممکن ہے کہ انھوں نے ایسا کوئی فتویٰ دیا ہو یا اہل مدینہ کی اکثریت نے بیعت توڑی ہو۔ امام مالکؒ تو اس وقت امیر المؤمنین المنصورؒ کے فرمان کے مطابق مؤطا شریف کی تدوین میں مشغول تھے۔ انھیں اس خالص تخریبی ہنگامے سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ جو نصوص صریحہ و ثابتہ کے خلاف تھا اور خود ان کے کھلے ہوئے مذہب کے بھی خلاف۔

عمدۃ الطالب کے مصنف کی یہ بھی صریح غلط بیانی ہے کہ امیر المؤمنین المنصورؒ کا دل امام مالکؒ سے پھر گیا تھا۔ کیونکہ صفحات تاریخ پر دیکھا جا سکتا ہے کہ امیر المؤمنین نے مؤطا شریف کی تدوین کی خدمت ان کے سپرد کی تھی۔ اور جو فرمان انھیں بھیجا تھا اس کے الفاظ یہ ہیں (مقدمہ ابن خلدونؒ ص ۱۸ طبع مصر)

یا ابا عبد اللہ لم یبق علی وجہ الارض اعلم منی ومنک وانی قد شغلتنی الخلافۃ فضع	اے ابو عبد اللہ اس وقت روئے زمین پر مجھ سے اور آپ سے بڑا کوئی عالم نہیں مجھے تو خلافت نے مشغول کر رکھا ہے

انت للناس کتابا ینتفعون بہٖ تجنب فیہ عن رخص ابن عباس وشدائد ابن عمر۔ ووطئہ للناس توطئۃ۔ قال مالکؒ فواللہ لقد علمنی التصنیف یومئذٍ۔ ولذا سمّیٰ کتابہ المؤطا۔

لہٰذا آپ لوگوں کے لئے ایک کتاب مدوّن کیجئے جس سے وہ نفع اٹھاتے رہیں اس میں حضرت ابن عباسؓ کی ترجی اور حضرت ابن عمرؓ کی سختی سے پرہیز کیجئے اور اسے لوگوں کے لئے خوب خوب روندئے (یعنی بغایت تحقیق کیجئے) امام مالکؒ فرماتے ہیں بخدا اس طرح انھوں نے مجھے تصنیف کا طریقہ سکھادیا اور اسی لئے آپنے کتاب کا نام الموطا رکھا (خوب روندی ہوئی یعنی بغایت تحقیق)

بعض مورخوں نے حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن عمرؓ کے ساتھ فرمان میں حضرت ابن مسعودؓ کا بھی نام لیا ہے" کہ ان کے غرائب سے بچیں۔ یعنی ان مسائل سے جو دوسرے صحابہ کے یہاں معروف نہ ہوں۔ پھر فرمان میں یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ اوسط امور کا خیال رکھئے اور صحابہ کے اجماعی مسائل مدوّن کیجئے" اس انداز میں جس شخص کو مخاطب کیا جائے تو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ کاتب کے دل میں اس کی عظمت اور اہلیت کا احساس نہ تھا اور کیسے کہہ سکتے ہیں کہ امیرالمؤمنین کا دل ان سے پھر گیا تھا۔ ان کا دل بے وجہ کیوں پھرتا، اور اگر پھرتا تو اس کے کچھ آثار تو ہوتے۔

جو امر عیاں ہے وہ یہ کہ مؤطا شریف کو قرآن مجید کے بعد عالم اسلام میں دستور اساسی کی حیثیت حاصل ہوئی اور مشرق ومغرب میں اسے مستند سمجھا گیا۔ یعنی اس کی جو مقبولیت خلافت عباسیہ میں تھی وہی اندلس کی اموی امارت وخلافت میں اسے حاصل رہی۔ امیرالمؤمنین المنصورؒ کی زندگی میں:

کتاب مکمل نہ ہوسکی لیکن خلفاء اسلام میں سے پانچ نے اس کی سماعت خود امام مالکؒ سے کی ہے یعنی خلیفہ المہدیؒ، الہادیؒ۔ الرشیدؒ، اور الامینؒ اور المامونؒ نے

امام مالکؒ اور ان کی اس کتاب کی عظمت امیرالمؤمنین ہارون الرشیدؒ کے ہاں اتنی تھی کہ خلیفہ ہونے کے بعد محض اس کی سماعت کے لئے اپنے دونوں فرزندوں کے ساتھ مدینہ طیبہ کا سفر کیا تھا۔ پھر جب سلطان غازی صلاح الدین ایوبیؒ کو معلوم ہوا۔ امیرالمؤمنین ہارون الرشیدؒ نے مؤطا شریف کے جس خاص نسخے کی سماعت کی تھی وہ مصر کے خزانے میں محفوظ ہے، تو ان کی پیروی کی برکت حاصل کرنے کے لئے آپنے اس نسخہ سے سماعت کے لئے مصر کا سفر کیا ان دونوں شخصیتوں کے علاوہ غالباً کسی تیسرے کا نام نہیں لیا جا سکتا جس نے حکومت پر فائز ہونے کے بعد طلب علم کے لئے سفر کیا ہو۔ (تاریخ الخلفاء ص ۲۹۴، طبع مصر)

امام مالکؒ کا عمل اگر وہ ہوتا جو شیعی مصنفوں نے بیان کیا ہے اور دوسروں نے اسے شہرت دی تو نہ عالم اسلام میں ان کی یہ حیثیت تسلیم کیجاتی کہ لوگ ہجوم کرکے ان کی خدمت میں حاضر ہوں اور نہ خلفاء کرام کے یہاں ان کا یہ احترام ہوتا، کیونکہ ان کا شمار پھر باغیوں میں ہو جاتا جن کے نہ فیصلے قانونی حیثیت رکھتے ہیں اور نہ گواہوں کی گواہی۔

اب دلچسپ بات یہ ہے کہ شیعی مصنفوں نے جعفر الصادقؒ کے موقف کی اشاعت پہ توجہ نہ کی جو اس وقت خاص مدینے میں موجود تھے لیکن امام مالکؒ پر اس خیالی فتویٰ کا بہتان رکھ کر اسے خوب اچھالا، اور انہیں طرح عملاً ثابت کر دیا کہ اہلِ مدینہ کے یہاں فتویٰ امام مالکؒ کا چلتا تھا۔ ہمارے نزدیک امام مالکؒ نے فتویٰ ضرور دیا ہوگا مگر وہی جو ان کے کھلے مذہب کے مطابق

کہ گھر دن میں بیٹھیں اور اس شورش میں شریک نہ ہوں اسی پر آپ نے خود بھی عمل کیا اور اہلِ مدینہ کی اکثریت نے بھی۔ حتیٰ کہ جو تھوڑے لوگ محمد الارقط کے ساتھ میدان میں نکلے تھے وہ بھی تائب ہو کر واپس ہو گئے اور اگر خود محمد الارقط تائب ہو جاتے تو یہ حادثہ کیوں رونما ہوتا۔

یعقوبی افسانہ اموی اور عباسی خلافتوں کے غیر آئینی اور محمد الارقط حسنی کی بغاوت کو قانونی حیثیت دینے لئے شیعہ مورخ یعقوبی نے یہ افسانہ گھڑا ہے کہ:۔

"بنو ہاشم کا ایک خفیہ اجلاس ہوا۔ جس میں ابو جعفر المنصور بھی تشریف رکھتے تھے۔ وہاں اموی خلافت کے متوازی خلافت قائم کرنے کے لئے محمد حسنی کا انتخاب کیا گیا اور سب نے مع ابو جعفر المنصور ان سے بیعت کر لی۔ اس اجلاس میں شرکت کیلئے ابو جعفر الصادق کو بھی بلایا گیا تھا۔ مگر انھوں نے یہ صورت حال دیکھ کر فرمایا کہ یہ منصب آپ میں کسی کو نہ ملے گا، یہ تو اس زرد قبا والے کا حق ہے یعنی ابو جعفر المنصور کا، اسی وقت سے المنصور کے دل میں حصول خلافت کا جذبہ پیدا ہوا۔

یہ روایت از سرتا پا ہیچ محض ہے۔

ا۔ سب بنو ہاشم ایسے بے اصول اور منافق نہ تھے کہ علانیہ تو خدا و رسول کے نام پر بیعت کریں، ان کے جائز اور آئینی امام ہونے کا اقرار کریں اور خفیہ خفیہ حریف خلافت بھی قائم کر ڈالیں اور وہ بھی بغیر وسائل کے، قرآن حکیم نے ایسی خفیہ کارروائیوں پر سخت توبیخ کی ہے۔ کیونکہ یہ امت کے ساتھ غداری ہے۔

۲۔ جعفر الصادقؒ اور ان کے والد ماجد خالص غیر سیاسی اور علمی زندگی بسر کرتے تھے اور صمیم قلب سے خلفاء کی بیعت پر مستقیم رہے، سیاسی ہنگامہ آرائی ان کے مسلک کے خلاف تھی۔ اس لئے ناممکن ہے کہ ایسے تخریبی اجلاس میں شرکت فرمائے۔

۳۔ ابو جعفر المنصورؒ کے گھرانے کی اپنی تحریک سالہا سال پہلے سے خالص تعمیری انداز میں چل رہی تھی جس میں قواعد شرعیہ کا پورا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ اسی لئے اس کا امکان نہ تھا کہ وہ اپنے برادر بزرگ، والد والد اور جد امجد کی عالم گیر عوامی تحریک کو نقصان پہنچانے اور اسے تخریبی رنگ دینے کے لئے ایسے باغیانہ اجلاس میں شریک ہوتے۔

۴۔ اس روایت کے ہیچ محض ہونے کی عملی دلیل یہ ہے کہ امیر المومنین المنصورؒ کی ولادت ۹۵ھ کی ہے (یعنی آپ عہد صحابہ میں پیدا ہوئے تھے) دعوت عباسیہ ۱۰۰ھ میں شروع کی گئی۔ اس وقت آپ کی عمر صرف پانچ برس کی تھی۔ اور ایسا بچہ کسی زبردست سیاسی اجلاس میں کیسے پہنچ جاتا۔

غرض یہ ہے کہ یعقوبی نے اس فرضی اور خیالی اجلاس کے انعقاد کا افسانہ نہایت بے عقلی سے گھڑا ہے جسے دیگر مورخین خصوصاً شیعہ مولفین نقل کرتے رہے ہیں۔ نہ دعوت کی ابتدا سے پہلے ایسے کسی اجلاس کا امکان تھا کیونکہ حضرت امام محمد عباسیؒ کی اپنی تحریک بالکل خفیہ تھی اور آل علی کے نام نہاد شیعہ کی فتنہ سامانیوں کے سبب انھیں اس میں شریک کرنے کی غلطی وہ نہیں کر سکتے تھے۔ دعوت کے اجراء کے بعد تو ایسے کسی اجلاس میں شرکت کا سوال ہی نہ تھا جیسا کہ مذکور ہوا۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ ایسا کوئی اجلاس منعقد ہی نہیں ہوا۔ بنو ہاشم خلافت قائمہ کے وفادار تھے اور جنھوں نے

بغاوت کی انھیں خود اپنے گھر والوں کی بھی حمایت حاصل نہ ہوئی چہ جائیکہ امت ان کی طرف جھکتی۔ چند سبائیوں کے علاوہ انھیں اپنے حمایتی نہ مل سکے اور سبائی وہ تھے جو یوں تو بڑھ بڑھ کر باتیں بناتے اور عقیدت کا اظہار کرتے تھے مگر عین وقت پر اپنے یار و مددگار چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے۔

یعقوبی نے روایت اس انداز میں لکھی ہے کہ جیسے عبداللہ المنصور عباسیؒ اور محمد الارقط حسنی پختگی عمر کو پہنچ چکے ہوں کہ بنو ہاشم کا ایسا اجلاس منعقد ہو تو اس میں ان کی شخصیتیں نمایاں ہوں۔ حالانکہ ان دونوں کی عمر تو اس وقت اتنی ہوئی جب خلافت عباسیہ قائم ہو چکی تھی۔ تو پھر اس کا امکان کہاں تھا کہ محمد الارقط بن عبداللہ حسنی کی صدارت میں اجلاس ہو اور ابو جعفر المنصورؒ عباسی اس میں ایک عام فرد خاندان کی حیثیت سے جا بیٹھیں۔ یعنی اپنے ہی خلاف ریشہ دوانیاں کرنے وہاں پہنچ جائیں۔

امام ابو حنیفہؒ اور ابراہیم حسنی

اوپر بیان ہوا کہ راویوں کے بقول محمد الارقط حسنی اور ان کے بھائی ابراہیم نے مدینے اور بصرے میں یک وقت خروج کا منصوبہ بنایا تھا۔ راوی کہتے ہیں کہ ابراہیم حسنی چونکہ اچانک بیمار پڑ گئے اس لئے وقت موعود پر کھڑے نہ ہو سکے اور یوں ایک ساتھ دو محاذ کھول دینے کا موقعہ جاتا رہا۔ بہر حال ابراہیم نے بعد میں خروج کیا۔ اب سوال ہے کہ منصوبہ تو اتنا بڑا بنایا گیا تھا کہ حکومت قائمہ کا تختہ فوجی طاقت سے الٹ دیا جائے۔ مگر محض ایک شخص کے بیمار پڑ جانے سے خروج ملتوی کر دیا گیا۔ اگر واقعی تیاری مکمل تھی۔ سامان حرب فراہم تھا خفیہ فوج تیار کر لی گئی تھی، تمام تفصیلات طے تھیں۔ اور یہ بھی معلوم تھا کہ مدینہ طیبہ اور بصرے کے درمیان کتنا فاصلہ ہے

یعنی دونوں شہروں میں رابطہ قائم کرنے اور فوری پیغام رسانی کے وسائل موجود تھے تو پھر وقت موعود پر خروج کیوں نہیں کیا گیا۔ کیا ابراہیم حسنی کے علاوہ کوئی آدمی ایسا نہ تھا جو اس "فوج" کی قیادت کر سکے؟ یہ عجیب بات ہے کہ منصوبہ تو بنایا جائے انقلاب لانے کا لیکن جو "فوج" تیار کی جائے اس میں کوئی قابل اعتماد آدمی نہ ہو یا پھر یہ منصوبہ خود اپنے آدمیوں سے بھی پوشیدہ رکھا گیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ بعد کی وضع کردہ باتیں ہیں۔ نہ یہ دونوں خروج کسی منصوبے کے تحت تھے اور نہ ان کے لئے کوئی مؤثر تیاری کی گئی تھی معمولی غور و فکر سے وہ سب داستانیں ہیچ ثابت ہوتی ہیں جو ان دونوں خروجوں کو اہمیت دینے کے لئے بیان کی گئی ہیں۔ سوائے عقیم شخصی طالع آزمائی کے ان دونوں خروجوں کو کچھ اور نام نہیں دیا جا سکتا۔ کہا جاتا ہے کہ محمد الارقط وغیرہ کی یہ ایک عظیم الشان تحریک تھی اور دعوت عباسیہ ہی کی طرح عالم گیر۔ یعنی ان کے داعی بھی دنیا بھر میں عباسی داعیوں کے متوازی کام کر رہے تھے۔ لیکن اس خیالی منظر کشی کی نمود کسی جگہ اور کسی موقع پر نظر نہیں آتی۔ محمد الارقط ہوں یا ان کے بھائی ابراہیم یا اور کوئی علوی، ان میں سے ہر ایک کا خروج بغیر کسی تنظیم کے ہوا۔ اور بغیر کسی محکم اور تعمیری نصب العین کے ہوا۔ اسی وجہ سے ان میں سے کسی کو اتنے مددگار نہ مل سکے جو واقعی کسی درجے میں انقلاب لا سکیں اور مرکز پر ان کا قبضہ ہو سکے۔
خلافت عباسیہ کے انحطاط کے وقت دور و دراز علاقوں میں بعض علویہ کا قبضہ لے شک ہو گیا لیکن اکثر و بیشتر وہ بھی عارضی ثابت ہوا۔
ابراہیم نے خروج بصرے میں کیا تھا اور کہتے ہیں کہ ان کے ساتھ

تنی زبردست جماعت تھی کہ امیر المومنین المنصور پریشان ہو گئے۔ راویوں نے یہ خیالی گھوڑے تو دوڑا دئے۔ مگر نتیجہ یہ نکلا کہ معمولی جھڑپ میں ابراہیم شکست کھا گئے اور سب قصہ تمام ہوا۔

پھر کوئی سلیم العقل شخص کیا یہ باور کرسکتا ہے کہ ایک خاص منصوبے کے تحت خلافت عباسیہ کا تختہ الٹنے کے لئے یہ دونوں بھائی تیاریاں کر رہے تھے، سامان حرب جمع کیا جا رہا تھا اور فوجوں کی تنظیم ہو رہی تھی لیکن نہ مدینے میں کوئی بے چینی تھی اور نہ بصرے میں دونوں شہروں کے والی خواب خرگوش میں محو تھے۔ اور انھیں خبر نہ تھی کہ ان کے شہروں میں کن عزائم کے تحت کیا کام ہو رہا ہے۔ امیر المومنین کے فرمان کے مطابق کوفے اور بصرے سے اور دنیا جہان سے دارالخلافہ کی تعمیر کے لئے کارکن جمع کئے جا رہے تھے اور سب کام اطمینان سے ہو رہا تھا۔ مگر نہ امیر بصرہ کو خبر تھی کہ ان کے شہر میں ہزاروں افراد نے ابراہیم کی فوج میں نام لکھا دیا اور بیعت توڑ کر خروج کی تیاریاں کر رہے ہیں اور نہ امیر المومنین ہی کے جاسوس کوئی اطلاع آپ تک پہنچاتے تھے۔ اگر بصرے میں کوئی بے چینی ہوتی تو جیسے ایک فوجی دستہ مدینہ طیبہ بھیجا گیا تھا۔ ایسا ہی کچھ انتظام بصرے کے لئے بھی ہوتا تاکہ فتنہ سر اٹھاتے ہی ختم کر دیا جائے۔ یعنی ایک زبردست انقلابی تحریک کی موجودگی میں امیر المومنین کی توجہ اس تحریک کو کچلنے پر مرکوز ہوتی نہ کہ دارالخلافہ کی تعمیر پر۔ یہ کام نہایت امن و امان کے زمانے میں ہوتا ہے۔ کیا اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ ان دونوں علویوں کا خروج نہایت حقیر اور وقتی ہنگامہ تھا جو فرو ہو گیا۔ اور ایسا ہنگامہ ایک عظیم الشان حکومت کے رقبے میں

کہیں نہ کہیں ہوتا ہی رہتا ہے۔

اب دیکھنا ہے کہ امام اعظمؒ حاضر ہیں بارگاہِ خلافت میں اور اہم کی انجام دہی میں مشغول، لیکن فتویٰ جاری کر رہے ہیں ابراہیم کے خروج کی حمایت میں یعنی نہ کتاب وسنت کی پروا ہے اور نہ خود اپنے اور اپنے مشائخ کے کھلے ہوئے مذہب کی۔ اس کے بعد سوال ہے امام صاحب اس خیالی فتوے کو اتنی شہرت کیوں دی جا رہی ہے۔ بقول ان مؤلف کے جب "ابنا رسول اللہؐ" ایک دینی اور ملی تقاضا پورا کرنے کھڑے ہوئے تو انھیں ایک عجمی عالم کے فتوے کی کیا ضرورت تھی؟ دین تو بقول ان کے ان ہی کے گھر سے نکلا تھا نہ کہ بلادِ عجم سے۔

وجہ یہ ہے کہ حضرت امام اعظمؒ کے شاگردوں نے تمام عالم اسلام میں حنفی مذہب رائج کیا اور امت کی بھاری اکثریت نے اس دین کی پیروی کی اسلئے بعد کے مسلمانوں کو علویوں کے خروج کی اہمیت اور حقانیت ثابت کرنے اس فرضی اور اختراعی فتویٰ کا سہارا لیا گیا، ورنہ مسلمان جو امام اعظمؒ کے متبع ہیں وہ مذہب حنفی کے مطابق ایسے خروجوں کو صریح بغاوت اور ملت اسلامیہ سے غداری تصور کرتے ہیں۔ اس لئے انھیں دھوکہ دینے کے لئے یہ بات وضع کی گئی کہ امام صاحب نے ابراہیم کے حق میں فتویٰ دیا تھا، اس بحث نہیں کہ حضرت امام اس وقت کہاں تھے کن فرائض کی بجا آوری میں مشغول تھے۔ اور ابراہیم سے ان کا رابطہ ہو بھی سکتا تھا یا نہیں۔

پھر یہ سوچا گیا کہ فتویٰ کی بات اس وقت تک وزنی نہیں ہو سکتی جب تک امام کے قید ہونے اور ان پر کوڑے پڑنے کی داستانیں بیان نہ کی جائیں، اس لئے ان روایتوں کا تانا بانا بنایا گیا۔ لیکن اتنا پھر بھی خیال

نہیں کیا گیا کہ امام صاحب کی موجودہ عظمت وشان تو دنیائے اسلام میں ان کے شاگردوں کے سبب قائم ہوئی۔ جنھوں نے اپنے امام کے مآثر علمیہ اور فقہی افکار کو کتابی شکل دے کر اہل عالم کو اس عظیم شخصیت کے افکار سے روشناس کیا۔ ورنہ ۱۴۵ تا ۱۵۰ھ میں ان کی حیثیت ایسی نمایاں کہاں تھی کہ امیرالمؤمنین یا امت میں ان کی مقبولیت کا رعب پڑے۔ وہ بھی ہزارہا علماء کی طرح ایک بڑے عالم تھے مجتہد مطلق اور مقتدائے عالم تو انھیں بعد میں تسلیم کیا گیا، امام یحیی بن معینؒ فرماتے ہیں۔ (البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۱۱۶) العلماء اربعۃ الثوری وابوحنیفۃ ومالک والاوزاعی (عالم چار ہیں سفیان ثوری ابوحنیفہ، مالک، اور اوزاعی) ان میں سے دو کے شاگرد اتنے بڑے تھے کہ اہل عالم میں وہی مشہور ہوئے اور ان کے افکار دنیا میں پھیلے یعنی امام اعظم ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ۔ امام اوزاعیؒ کے افکار بھی امام اعظمؒ کے شاگردوں ہی کے طفیل سے مشہور ہیں۔ مگر کتابوں کی حد تک، عامۃ المسلمین تو ان کے نام بھی نہیں جانتے۔ حالانکہ اپنے علم وفضل میں وہ ان دونوں بزرگوار دل سے کچھ کم نہ تھے۔ غرض یہ ہے کہ دنیائے اسلام میں جو عظمت امام اعظمؒ کی تسلیم کی جاتی ہے وہ اس وقت انھیں حاصل نہ تھی۔

امیرالمؤمنین المنصورؒ نے جس طرح محمد الارقط حسنی اور ان کے بھائی ابراہیم کی بغاوتوں کا قصہ پاک کیا اور ان کے دوسرے چند عزیزوں کو جرم بغاوت کی اعانت میں قید وبند کی سزا دی، اسی طرح وہ امام صاحب کو بھی شہادت کے درجے پر فائز کر سکتے تھے۔ کیونکہ یہ حقیقت ناقابل تردید ہے کہ نہ محمد وابراہیم کی بغاوت فرد کرنے کے نتیجے میں امت کے اندر کوئی ہیجان پیدا ہوا اور نہ دوسرے ابناء رسول اللہؐ کے قید ہونے پر۔ کیونکہ ہم عصر امت صورت

حالل جانتی تھی۔ اسی طرح امام صاحب کے قید کئے جاتے، کوڑے لگائے جا
اور زہر سے قید خانے میں ختم کئے جانے کی داستانوں کے باوجود کوئی شخص
ثابت نہیں کر سکتا کہ اہل بغداد نے یا دنیائے اسلام کے کسی دوسرے گ
میں مسلمانوں نے امام اعظمؒ کی بابت کسی واقعی یا موہوم سانحے کا کوئی ا
نہیں لیا ہو، امام صاحب کو علانیہ قتل کر دیا جاتا، تب بھی "آل رسول" کے مقابلے میں انکی کیا اہمیت ہو
امام ابو حنیفہؒ کے متعلق یہ سب لغو باتیں بعد کے لوگوں کی تراشی ہوئی ہیں اور انکی وفات
تین سو برس بعد اس وقت وضع کی گئیں جب سبائی پروپیگنڈا اپنے عروج پر تھا اور حضرت امام کو امام
مجتہدِ مطلق اور مقتدائے عالم تسلیم کر لیا تھا تاکہ وہ مسلمان جو علویوں کے خروج اور انکے انجام پر ر
نہ ہوئے انھیں امام اعظمؒ اور امام مالکؒ پر خلافت قائمہ کے مظالم کی فرضی داستانوں ہی سے
متاثر کیا جائے۔ افسوس ہے کہ خطیب بغدادیؒ نے بے سوچے سمجھے یا امام
سے تعصب کے تحت یہ وضعی روایتیں اپنی کتاب تاریخ بغداد میں لکھ ماریں
بعد کے لوگ ان خرافات کو ایسے لے اڑے کہ آج اسے حقیقت ثابتہ یاد رکھا
جاتا ہے۔ تاریخ بغداد یا "مناقب نعمان" کی کتابوں میں ان روایتوں سے
سب نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں جن سے صحیح احوال کا پتہ چلایا جا سکتا ہے
اور واقعات ثابتہ کے مطابق ہیں۔ مگر جن کے دلوں میں بیماری ہے انھیں
صاف اور دل کو لگتی روایات کے مقابلے میں وہ واہی روایتیں مرغوب ہیں
جن کے ذریعہ خلفاء اسلام پر طعن کی گنجائش نکلے۔ کیونکہ ان کا اصل مقصد
یہ ہوتا ہے کہ اموی اور عباسی خلافتوں کی شرعی حیثیت پر حرف لا کر یہ ثابت
کریں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اور ان کا اتباع کرنے والوں نے ان خلفاء
پر اجماع کر کے دین مبین کو غارت کر دیا تھا اور بزعم خویش "ایک عظیم نقصان
اسلام" کے قول کے مطابق اپنی قیادت جاہلیت کے ہاتھ میں دیدی

تاریخی حقیقت یہ ہے کہ امام اعظمؒ کو نہ کبھی قید کیا گیا، نہ ان پر کوڑے
برسائے گئے، نہ انھیں زہر دیا گیا اور نہ انھوں نے زید و محمد و ابراہیم کی حمایت
میں فتویٰ دیا اور نہ حسن بن قحطبہ سے ان کی کبھی ایسی ملاقات ہوئی کہ وہ
انھیں خلافت قائمہ سے برگشتہ کرنے کی کوشش کریں۔ وہ پوری طرح
امیرالمؤمنین المنصورؒ کی بیعت پر قائم تھے اور قواعد شرعیہ کے مطابق ان
کے مطیع و منقاد رہے۔ منصب خلافت کی عظمت ان کے دل میں تھی۔ اور
امیرالمؤمنینؒ کی خدمات جلیلہ انجام دینا وہ اپنا دینی و ملی فریضہ جانتے تھے
اسی لئے ان کے نقش قدم پر ان کے عظیم المرتبت شاگرد چلے۔ اور دنیا کو
نور و حکمت سے بھر دیا۔

اگر امام اعظمؒ عیاذاً باللہ خلافت قائمہ کے خلاف ہوتے اور باغیوں
کے ہم نوا تو لازم تھا کہ امیرالمؤمنین کی نگاہوں سے گر جائیں اور ان کے شاگرد
کو بھی وہ مقام حاصل نہ ہوتا جو ہوا۔ بلکہ یہ عظیم المرتبت ائمہ بھی اپنے شیخ
امام کے مسلک کے خلاف حکومت قائمہ کے مناصب قبول نہ کرتے اور یہ ایک
ایسا اتفاقی سانحہ ہوتا کہ اس سے امت کا پورا مستقبل تباہ ہو جاتا۔ اور
یہ درخشانی ہرگز نہ آتی جس کی آب و تاب سے اہل عالم کی نگاہیں خیرہ ہیں
محمد الارقط و ابراہیم کے خروجوں میں امام اعظمؒ و امام مالکؒ کے موقف کی
وضاحت کے بعد ہم اب اس افترا پر متوجہ کرنا چاہتے ہیں جو امام ابوحنیفہؒ
اور مکتبۂ حنفیہ پر کیا گیا ہے۔ تدوین فقہ حنفیہ کے متعلق جو غلط بیانیاں
رسوائے عالم کتاب ”خلافت و ملوکیت“ میں کی گئی ہیں اس کی تنقیح و تردید
تو پہلے بھی کتاب ”حقیقت خلافت و ملوکیت“ میں کی جا چکی ہے۔

امیر المؤمنین المنصورؒ امام ابو حنیفہؒ اور مکتبۂ حنفیہ

امیر المؤمنین ابو جعفر عبداللہ الامام المنصور بن محمد الامام بن علی الامام بن عبداللہ حبر الامۃ بن عباسؓ عم رسول اللہ صلعم کا عہد مبارک ثقافت اسلامیہ کے ارتقاء میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ اس امت کے عظیم ترین ائمہ میں ہیں، حدیث و فقہ و لغت و ادب میں ایسے بلند پایہ کہ اگر حلقۂ درس قائم کرتے تو ان کے جد بزرگوار سیدنا عبداللہ بن عباسؓ کی یاد تازہ ہو جاتی، دور دور سے لوگ طلب علم کے لئے حاضر ہوتے، امام ابن کثیر فرماتے ہیں (البدایہ والنہایہ ج۔ ۱ ص ۱۲۶)

وکان المنصور فی شبیبتہ	اپنی جوانی میں المنصورؒ نے ہر صاحب
یطلب العلم من مظانہ والحدیث	کمال سے علم حاصل کیا نیز حدیث و فقہ
والفقہ فنال جانبا جیداً	اس طرح آپ کو رتبۂ بلند اور درک
وطرفاً صالحاً	قوی نصیب ہوا۔

محدثوں کا جو طریقہ تھا کہ طلب حدیث کے لئے دور دور کا سفر کرتے تھے ایک شہر کے علماء سے فیض اٹھا کر دوسرے شہر کا رخ کرتے تھے ایسے سفر کو رحلۃ کہتے ہیں۔ امام المنصورؒ کی رحلۃ کا یہی عالم تھا۔ مشرق کا شاید ہی کوئی اہم شہر ایسا چھوڑا ہو جہاں طلب علم کے لئے نہ پہنچے ہوں، ابن خلدون نے اپنے مقدمے میں لکھا ہے (ص ۱۸ طبع مصر) وقد کان ابو جعفر بمکان من العلم قبل الخلافۃ وبعدھا (امیر المؤمنین) ابو جعفر علمی اور دینی اعتبار سے خلافت سے پہلے بھی بلند رتبہ تھے اور بعد میں بھی

ی امور خلافت میں انہماک سے آپ کے علم کی تازگی اور زہد و تقویٰ کی
قیت ماند نہیں پڑی تھی۔ ہم عصر علماء نے آپ کی علمی شان اور دینی عظمت
عتراف کیا ہے، جیسا کہ آگے معلوم ہوگا۔ اور یہ آپ ہی کی مساعیٔ جمیلہ کا
یہ تھا کہ علوم و فنون کی تدوین اور نشر و اشاعت کا وہ سلسلہ شروع
جس نے امت مسلمہ کو اہلِ عالم کے لئے نمونہ بنایا، اور دلوں میں اسکی
ردی کی لگن پیدا کر دی۔

رکت علمی

اموی عہد مبارک میں متمدن دنیا کا بہت بڑا رقبہ خلافت
اسلامیہ کے تحت آچکا تھا۔ تین براعظموں میں امت
ل چکی تھی اور ایسے مختلف النوع عناصر، ملت میں داخل ہو گئے تھے
ین مبین کو خالص شکل میں محفوظ و مدوّن کرنے کا مسئلہ پیدا ہو گیا، چنانچہ
فت عباسیہ کے قیام کے ساتھ ہی امیر المؤمنین المنصورؒ نے یہ محسوس
لیا کہ اب فتوحات کی بجائے وقت اس کا آگیا کہ ثقافت اسلامیہ کے
فظ و ارتقاء کی سبیل نکالی جائے۔ تاکہ دین کے تمام کلیات) و جزئیات
نی صورت میں مدوّن ہو جائیں، اور خلافت کا ایسا آئین و دستور مرتب
یا جائے جو آیندہ کے لئے مشعلِ راہ ہو، مسلمان اس قابل ہو جائیں کہ اپنی
دل و قواعد کے مطابق احوالِ حاضرہ کے ساتھ ساتھ چل سکیں یعنی انسانی
قا کے نتیجے میں جو مسائل سامنے آتے جائیں ان کا حل دریافت کرنے کی
درت و صلاحیت رکھیں، غیر عرب عناصر کے قوت پکڑ لینے سے اس اقدام کی
رورت اور بھی واضح ہو گئی تاکہ ثقافتوں کے تصادم کا نتیجہ تخریبی ہونے
ے اور کسر و انکسار کا انجام تعمیری رہے۔

یوں حکومت کے استحکام کے بعد، دار الخلافہ کی تعمیر سے بھی پہلے آپ نے

بڑے بڑے علمار عصر کو اس طرف متوجہ کیا اور ۱۴۳ھ میں قرائین نافذ کی
چنانچہ امام ذہبی فرماتے ہیں (تاریخ الخلفار طبع مصر)

في سنة ثلاث واربعين
شرع علماء الاسلام في هذا
العصر تدوين الحديث و
الفقه والتفسير فصنف
ابن جريج بمكة، ومالك
الموطاء بالمدينة والاوزاعي
بالشام وابن ابي عروبة و
حماد بن سلمة وغيرهما
بالبصرة، ومعمر وسفيان
الثوري بالكوفة، وصنف
ابن اسحٰق المغازي وصنف
ابو حنيفة رحمه الله الفقه
والرائ۔

ثم بعد يسير صنف
هشيم، والليث وابن لهيعة
ثم ابن المبارك وابو يوسف
وابن وهب وكثر تدوين
العلم وتبويبه ودونت
كتب العربية واللغة و

۱۴۳ھ میں اس زمانہ کے علمار اسلام
نے حدیث و فقہ اور تفسیر کی تدوین
شروع کی، چنانچہ ابن جریج نے مکہ میں
تصنیف کی اور (امام) مالک نے مدینہ
طیبہ میں مؤطار لکھی۔ (امام) اوزاعی
نے شام میں، ابن ابی عروبہ اور حماد
بن سلمہ وغیرہما نے بصرے میں،
معمر نے یمن میں، سفیان ثوری نے
کوفے میں، کتابیں لکھیں اور امام
ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے فقہ اور رائے
مدوّن کی۔ پھر کچھ دن بعد ہشیم نے، لیث
نے ابن لہیعہ نے اور پھر ابن المبارک
ابو یوسف نے اور ابن وہب نے کتابیں
یوں علم کی تدوین ترتیب کی کثرت ہوئی
عربیت، لغت، تاریخ اور احوال الناس
پر کتابیں لکھی گئیں۔ اس سے پہلے
ائمہ یا تو اپنے حفظ سے تعلیم
کرتے تھے، یا ایسے صحیح نوشتوں
سے جو غیر

التاریخ وایام الناس وقبل ھذا العصر کان الائمۃ یتکلمون من حفظھم او یروون العلم من صحف صحیحۃ غیر مرتبۃ — مرتب تھے۔

اموی عہد میں اس کی ضرورت نہ تھی کہ تحریری کام ہو کیونکہ وہ زمانہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا جو تمام عالم اسلام میں پھیلے ہوئے تھے اور ہر جگہ ان کا فیض جاری تھا، اور ان کے صحبت یافتہ حضرات ان کے علوم کی اشاعت کر رہے تھے۔ جگہ جگہ علماء و فقہاء کے حلقہائے درس قائم تھے اور اہل عرب کے طرز پر تمام تدریس زبانی ہوتی تھی۔ یعنی علم سینہ بسینہ چلتا تھا مسلمانوں کی زیادہ توجہ جہاد فی سبیل اللہ پر تھی۔ وہ جدھر رخ کرتے تھے ان کی فطری تعلیمات کی سادگی اور ان کے کردار کی رفعت دلوں کو موہ لیتی تھی۔ فقہی موشگافیوں کی بجائے مدار سادگی عمل پر تھا۔ اموی خلیفہ عمر الثانی رح نے اگرچہ علماء وقت کو تصنیف و تالیف پر متوجہ کیا تھا۔ اور بعض رسائل اور نوشتے مرتب بھی ہو گئے تھے، لیکن یہ کام ابتدائی تھا۔ اور نوشتوں کی حیثیت ایسی نہ تھی کہ انھیں مدون اور مبسوط تصنیفات کا درجہ دیا جائے جیسا کہ امام ذہبی رح نے وضاحت فرما دی ہے۔ ویسے تحریری کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور ہی میں شروع ہو چکا تھا۔ آپ نے متعدد فرامین کی ذریعہ مسائل پر رسالے مختلف مقامات پر بھجوائے تھے اور سیدنا عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما نے احادیث کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا۔ چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ رض کا یہ بیان محفوظ ہے (ج ص ۲۱ طبع مصر

مامن اصحاب النبی صلی اللہ — نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے

علیہ وسلم احد اکثر حدیثاً عنہ منی الا ما کان من عبد اللہ بن عمرو فانہ کان یکتب ولا اکتب

کوئی صاحب آپ کی احادیث بیان کرنے میں مجھ سے زیادہ نہیں سوائے عبد اللہ ابن عمرو (بن العاص) کے کیونکہ وہ لکھا کرتے تھے اور میں لکھتا نہیں تھا۔

لیکن آخر عہد اموی تک علماء و فقہاء کا عام طریقہ کار یہی تھا کہ حفظ سے درس دیا کرتے تھے۔ شاگرد جو سنتے اسے دماغوں میں محفوظ رکھتے تھے اگر کسی نے کچھ لکھا بھی تو حفظ کرنے کے لئے۔ چنانچہ ابن عبد البرؒ نے جامع بیان العلم میں امام مالکؒ کا یہ قول نقل کیا ہے " لم یکن القوم یکتبون انما کانوا یحفظون فمن کتب منھم شیئاً فانما یکتبہ لیحفظہ فاذا حفظہ محاہ (لوگ لکھا نہیں کرتے تھے بلکہ صرف یاد کیا کرتے تھے اور اگر ان میں سے کسی نے کچھ لکھا تو یہ تحریر محض حفظ کرنے کے لئے ہوتی تھی۔ جب وہ حفظ کر لیتا تو مٹا دیتا۔

یہ عرب کا قاعدہ تھا اور اللہ تعالیٰ نے انھیں حفظ کی خاص صفت سے نوازا تھا۔ ایک دفعہ کی بات سنی ہوئی ان کے دماغوں میں محفوظ رہتی تھی۔ اسی لئے وہ اپنی قوت حافظہ قائم رکھنے کے لئے کتابت سے گریز کرتے تھے، اور یہ نفسیاتی مسئلہ ہے کہ جو شخص ظاہر پر تکیہ کرتا ہے اس کی باطنی قوت گھٹ جاتی ہے۔ ابن عبد البرؒ نے ان علماء کے اقوال نقل کر کے جو کتابت پسند نہیں کرتے تھے لکھا ہے۔

من ذکرنا قولہ فی ھذا الباب فانما ذھب فی ذلک مذھب العرب لانھم کانوا مطبوعین علی الحفظ مخصوصین بذلک

اس موضوع پر جن جن کا قول ہم نے دہرایا ہے تو ان کا طریقہ وہی تھا جو عربوں کا ہوتا ہے وہ فطری طور پر یاد رکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور

الذین کرھوا الکتاب کابن عباس، والشعبی وابن شهاب النخعی وقتادة ومن ذهب مذهبهم وجبل جبلتهم کانوا قد طبعوا علی الحفظ

یہ ان کی خصوصیت ہے جو حضرات لکھائی پسند نہیں کرتے جیسے حضرت ابن عباسؓ امام شعبیؒ امام ابراہیم النخعیؒ اور حضرت قتادہؒ اور وہ سب لوگ جن کا یہی طریقہ تھا اور ایسی ہی ذہنیت تھی انہیں طبعی طور پر حفظ کرنے کا ملکہ تھا۔

چنانچہ امام شعبیؒ فرماتے ہیں "ماکتبت سوادًا فی بیاض ولا استعدت حدیثا من انسان (میں نے کوئی بات کاغذ پر نہیں لکھی اور نہ کسی شخص سے اپنی بات دوبارہ کہنے کو کہا) حضرت ابن عباسؓ نے عمرو بن ربیعہ کا قصیدہ ایک دفعہ سن کر اسی طرح سنا دیا تھا، یہ تھا عرب کا حال، اور وہ ماحول جب تک قائم رہا۔ غیر عرب بھی اسی طرز پر چلے لیکن خلافت عباسیہ کے قیام کے بعد صورت حال بدل گئی۔ اور معاشرے کا تقاضا یہی ہوا کہ اب حفظ پر مدار نہیں ہو سکتا ورنہ ایک منظم اور آئینی حکومت اس طرح چل سکتی ہے کہ اس کا قانون کتابی صورت میں مدون نہ ہو۔

اس بارے میں امیر المؤمنین المنصورؒ کی لگن اور عزیمت کا یہ عالم تھا کہ اپنے بھتیجے کے علاوہ اکابر میں سے بعض کو بالمشافہ گفتگو کے لئے طلب فرمایا

امیر المؤمنین المامونؒ کا حافظہ بھی تعجب انگیز روزگار تھا۔ عبد اللہ بن ادریس کی خدمت میں حاضر ہوئے جو امام اعظمؒ کے اکابر تلامذہ میں ہیں۔ انھوں نے سو حدیثیں بیان کیں بعد میں المامون نے عرض کیا عم محترم اجازت ہو تو یہ احادیث سناؤں۔ ابن ادریس نے فرمایا سناؤ تو انھوں نے من وعن سب سنا دیں۔ ابن ادریس دنگ رہ گئے۔ یہ زمانہ مامون کی ولایت عہد اور طالب علمی کا تھا (تذکرۃ الحفاظ)

جیسے امام اعظمؒ اور امام اوزاعی کو۔ چونکہ امام مالکؒ کسی طرح مدینہ طیبہ سے باہر جانے پر تیار نہیں تھے۔ اس لئے ان کے پاس خود جا کر گفتگو کی۔ اسوقت عالم اسلام میں تین فقہی مکتب تھے، حجازی، عراقی اور شامی اور ہر مکتبے میں استخراج مسائل کے لئے، منجملہ منقولات کے مقامی "عرف" کا بھی لحاظ رکھا جاتا تھا۔

عرف فقہی امور میں کتاب وسنت کے صریح احکام کے علاوہ عرف بھی ایک دلیل شرعی ہے۔ یعنی معاشرات اور معاملات میں مقامی رسم ورواج کے مطابق طریقۂ کار، ہر دستور جو احکام شرعیہ کے خلاف نہ ہو اور اس میں لوگوں کے لئے آسانی نظر آئے اور عمومی منفعت معلوم ہو اسے باقی رکھا جاتا ہے۔ دعوت محمدیہ کا منشا یہ نہیں ہے کہ اقوام عالم کے ثقافتی اور تہذیبی شعائر ورسوم کو منسوخ ومردود قرار دے، وہ تو ایک ارتقائی تحریک ہے، اور عظیم ترین، جو تمام نوع انسانی پر اتمام نعمت کے لئے اللہ تعالیٰ نے جاری کی اسی لئے مسلمانوں نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ قوموں کا ثقافتی سرمایہ محفوظ کریں ان کے علوم وفنون کو ترقی دیں اور ان کے تمام امور کو عربی قالب دیکر ارتقائی انداز میں سب کا مشترک سرمایۂ حیات بنادیں، یعنی ان کے اختلافات کی تعدیل کر کے وجہ ائتلاف پیدا کریں۔ اسی لئے فقہاء کے ہاں عرف کی بڑی اہمیت ہے۔ ہر علاقے کی اپنی خصوصیات اور ہر ملک کے اپنے دستور ہوتے ہیں، سیاست معاشرت معاملات، قوانین مملکت اور آداب نظم ونسق وغیرہ امور سے وہاں کے لوگوں کو انس ہوتا ہے اور مناسبت ہوتی ہے۔ اب فقہاء کا کام ہے کہ اقوام عالم کے تجربات سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں اور جو امور کتاب وسنت کے صریح احکام سے متعارض نہ ہوں انھیں باقی رہنے دیں اور جہاں تعارض ہو وہاں ان کی اصلاح کریں

قواعد دینیہ کے تحت لے آئیں۔

جیساکہ مذکور ہوا اسوقت عالم اسلام میں تین فقہی مکتب تھے ایک فقہ حجاز جس کے علمبردار امام مالکؒ تھے یہاں کا عرف عربی تھا اور عموماً صحابۂ کرام کے قیاسی احول پر مبنی۔ دوسرا مکتب فقہی عراق کا تھا جس کی نمایندگی امام اعظمؒ کرتے تھے۔ یہاں کی معاشرت و ماحول میں عجمیت کا امتزاج تھا، تیسرا مکتب فقہ شام کا تھا جس کے مرجع امام اوزاعیؒ تھے۔ یہاں کی معاشرت اور آداب معیشت میں رومی تمدن کا امتزاج تھا، گویا ان تین مکتبہائے فقہ کے ذریعہ حجاز و عراق و شام کے عرف مستند قرار پائے اور یوں عرف کو عالم گیری ملی اور آیندہ کے لئے بھی طے ہوا کہ مسلمان جہاں جائیں وہاں کے عرف کی اناد دیت دیکھ کر اپنے اصول و قواعد کے تحت لے آئیں۔ اس طرح ثقافت اسلامیہ کا ارتقا ہوا۔

خلافت عباسیہ کے قیام میں بلاد عجم کی تائید کو زیادہ دخل تھا، اس لئے امیر المؤمنین المنصورؒ کی توجہ امام ابوحنیفہؒ کے طریقۂ استدلال اور طرز استنباط پر مرکوز ہوگئی، آپ نے امام صاحب کی یہ حیثیت پہچانی کہ انھیں اپنے حضور طلب کریں اور ان کے ذریعہ ایک وسیع تر فقہی مکتبے کی بنیاد رکھیں جو تمام عالم اسلام میں مقبول ہو سکے۔ اسی لئے امام اعظمؒ کو اپنے پاس رکھا۔ پھر آپ ہی کے فاضل شاگردوں کو خلافت عباسیہ میں اعلیٰ ترین مناصب پر فائز کیا گیا۔

امیر المؤمنین المنصورؒ کو اس کا خاص اہتمام تھا کہ جس شخص کے سپرد جو کام کریں اس کے بارے میں تحقیق کرلیں کہ اپنے فقہی اصول میں وہ صحابہ کرامؓ کے منہاج سے ہٹا ہوا نہ ہو۔ یہ غلط اطلاع آپ کو ملی تھی کہ امام ابوحنیفہؒ کے ہاں مدار قیاس پر ہے اور وہ حدیث پر اسے مقدم رکھتے ہیں اس لئے اس بارے میں ان سے وضاحت طلب کی امام صاحب کا یہ جواب شیخ ابوزہرہ نے اپنی

اپنی کتاب "ابوحنیفہ" میں بھی نقل کیا ہے (ص ۲۷۰)

یروی ان ابا جعفر المنصور کتب الیہ بلغنی انک تقدم القیاس علی الحدیث فرد علیہ ابو حنیفۃ برسالۃ جاء فیھا ولیس الامر کما بلغک یا امیر المؤمنین انما اعمل اولاً بکتاب اللہ ثم بسنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثم باقضیۃ ابی بکر و عمر و عثمان و علی رضی اللہ عنھم ثم باقضیۃ بقیۃ الصحابۃ ثم اقیس بعد ذلک اذا اختلفوا۔	روایت ہے کہ (امیر المومنین) ابوجعفر المنصورؒ نے انھیں لکھا "مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ، قیاس کو حدیث پر مقدم رکھتے ہیں" تو امام ابوحنیفہؒ نے انھیں مراسلہ بھیجا جس میں لکھا۔ امیر المؤمنین بات وہ نہیں ہے جو آپ کو پہنچی ہیں اول کتاب اللہ پر عمل کرتا ہوں پھر سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پھر حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے فیصلوں پر پھر باقی صحابہ کے فیصلوں پر اس کے بعد جب ان میں اختلاف پاتا ہوں تو قیاس کرتا ہوں۔

امیر المؤمنین المنصورؒ کو سنت کی حفاظت کا اتنا اہتمام تھا کہ اس بارے تمام امور کی نگرانی آپ خود فرماتے اور ہدایات دیدیتے تھے جیسا کہ تدوین آثار کے سلسلے میں امام مالکؒ کو آپنے فرمان بھیجا تھا جو ہم دوسری جگہ نقل کر رہے ہیں یعنی محمد الارقط بن عبداللہ حسنی کے خروج کے سلسلے میں، امیر المؤمنین موصوف کی اسی سعی مشکور کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

وھکذا اسس المنصور لحیوۃ علمیۃ ادبیۃ فی بغداد و	اس طرح (امیر المؤمنین) المنصور نے بغداد میں علمی ادبی زندگی کی

کان اول ما انشأ بها مدارس الطب والعلوم الدینیة انفق فی سبیلها اموالا طائلة

اور سب سے پہلے آپ نے وہاں طبی اور دینی علوم کی درسگاہیں قائم کیں اور اس راہ میں بے دریغ روپیہ خرچ کیا۔

یہی بات کتاب المعارف کے مقدمہ نویس "ثروۃ عکاشہ" نے لکھی کہ عباسی خلفاء کس طرح علوم و فنون کی تدوین اور نشر و اشاعت پر حریص تھے وہ وہ کہتے ہیں۔

کانوا من الخلفاء العلماء فرغبوا فی العلم واحسنوا وفادة اھله وشجعوھم علیہ وانتعشت بغداد بمن فیھا وبمن وفد الیھا و اصبحت میدانا لحرکة علمیة فکریة واسعة

یہ خلفاء چونکہ علماء تھے اس لئے انھوں نے تحصیل علم پر لوگوں کو متوجہ کیا اہل علم کی قدردانی کی اور اس پر انکی ہمت بندھائی، اس طرح بغداد علمی اور ثقافتی حیثیت سے پروان چڑھا، اور خود ان کے لئے جو وہاں رہتے ہوں اور ان کیلئے بھی جو باہر سے وہاں آئیں، فکری علمی حرکت کیلئے ایک وسیع میدان بن گیا۔

امام ذہبیؒ نے اپنے بیان میں یہ تصریح نہیں کی کہ ۱۴۳ھ سے تصنیف و تالیف کا جو کام شروع کیا گیا وہ امیر المؤمنین المنصورؒ کے فرامین کی پذیرائی میں تھا لیکن یہ بات خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے، ورنہ سب جگہ ایک ہی سال سے کام کیوں شروع ہوتا۔ جب تک مرکز کی طرف سے سب کو یہ یک وقت ہدایت نہ پہنچتی۔ اس زمانہ میں رسل و رسائل کے وسائل ایسے نہ تھے کہ ایک کام سن کر دوسرا بھی اسی وقت شروع کردے۔

علاوہ ازیں چند حضرات کے اسماء گرامی یہاں نقل کئے جاتے ہیں جن کے

متعلق صراحتاً معلوم ہے کہ ان کی تصنیف و تالیف کی ابتدا امیر المؤمنین المنصورؒ کے فرمان پر ہوئی۔

۱۔ امام مالکؒ - محمد الارقط بن عبداللہ حسنی کی بغاوت کے احوال میں وہ فرمان ہم نقل کر چکے ہیں جو امیر المؤمنین المنصورؒ نے آثار سلف کی تدوین کے سلسلے میں انھیں بھیجا اور ساتھ ہی تالیف کا طریقہ بھی بتا دیا۔ اسی فرمان کے آخری فقرے سے متاثر ہو کر انھوں نے اپنی کتاب کا نام ہی المؤطا رکھا۔

۲۔ محمد بن اسحاق - یہ ایک ایرانی الاصل شخص تھے۔ انھوں نے مغازی پر کتاب لکھی جس میں بے سر و پا حکایات بھی لکھ دیں۔ بہر حال یہ ابتدائی کام تھا۔ امیر المؤمنین نے ملاحظہ فرما کر اسے قبول بھی کر لیا مگر اس ہدایت کے ساتھ کہ اس کی تدوین دوبارہ کریں۔ چنانچہ سیرۃ ابن ہشامؒ کے مقدمے میں ہے کہ امیر المؤمنین موصوف نے فرمایا تھا "لقد طولتہ یا ابن اسحٰق اذہب فاختصرہ والقی الکتب الکبیر فی خزانۃ امیر المؤمنین (ابن اسحاق تم نے اُسے بہت طویل کر دیا۔ جاؤ اور اسے مختصر کر دو۔ پھر وہ طویل کتاب امیر المؤمنین کے کتاب خانے میں داخل کر دی گئی)۔

ابن اسحاق نے اسے مختصر کیا جو امت میں متداول ہے، انگریزی میں بھی اس کا ترجمہ ہو گیا ہے۔ مگر اہلِ علم نے اس پر نظر ثانی ضروری سمجھی، چنانچہ ابن ہشامؒ نے اسی سے اپنی مشہور و مقبول سیرۃ مرتب کی، اگرچہ پھر بھی بہت سی باتیں اس میں محل نظر ہیں اور اہل تحقیق ان کی نشاندہی کرتے رہتے ہیں

۳۔ امام اعظم ابو حنیفہؒ - امام صاحب کا طریقہ تدریس وہی تھا جس کی پابندی اموی عہد کے تمام علماء و فقہاء کرتے تھے۔ یعنی تعلیم زبانی ہوتی تھی اور علم سینہ بسینہ چلتا تھا۔ آپ کے باون برس عہد اموی میں گزرے اور

سی نہج پر جو آپ کے اساتذۂ کرام اور ہم عصر علماء کا تھا۔ یعنی تقریر پر مدار تھا
ور شاگرد سب ارشادات اپنے ذہن میں محفوظ رکھتے تھے۔ اگر کسی نے کچھ لکھا
بھی تو یاد کرنے کے لئے جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ عباسی عہد میں بھی ۱۴۲ھ
تک آپ نے یہی طریقہ قائم رکھا۔

لیکن جب ۱۴۳ھ میں آپ نے کتابی صورت میں اپنا علم مدوّن کرنا
چاہا۔ اور اس کیلئے خاکہ مرتب کیا تو دو برس بعد آپ کو بغداد طلب کر لیا گیا اور
آخری پانچ برس آپ کے وہیں گزرے۔ ان پانچ برسوں میں آپ کے متعلق
تین کام تھے۔ ایک دار الخلافہ کی تعمیر کی نگرانی، دوسرے یہ کہ بارگاہ خلافت
میں امیر المؤمنین کی فقہی آراء معلوم کرنے کے لئے دیار و امصار سے جو استفسار
آئیں ان کے مناسب جواب دینا۔ اور تیسرے یہ کہ خلافت اسلامیہ کے دفاعی
امور پر منضبط و مدوّن کتاب مرتب کرنا۔ گویا امام صاحب کی زندگی کے یہ
آخری پانچ سال انتہائی مشغولیت کے گزرے چنانچہ خود المکی نے اپنی
متضاد روایات کے انبار میں یہ سچی بات بھی لکھدی (مناقب النعمان ج ۱ ص ۱۰۱)

ان ابا جعفر کان نقل ابا حنیفة	(امیر المؤمنین) ابو جعفر نے (امام) ابو حنیفہ
من الکوفة الی بغداد وحبسه	کو کوفہ سے بغداد بلایا تھا اور اپنے ہی
عند نفسه و اراد علی القضاء	پاس انھیں ٹھیرایا کئی مرتبہ انھوں
غیر مرة فاعتذر و استعفی	قاضی بنانا چاہا مگر وہ نرمی اور ادب کے
واحتال بکل حیلة فی رفق	ساتھ قسم قسم کے حیلوں سے اس منصب
ومداراة حتی عفا عنه وامره	سے معاف رکھے جانے کے خواستگار ہو
بالاقامة علی بابه حتی یعرض	تاآنکہ انھوں نے انھیں معاف رکھا
علیه ما ورد من المسائل و	مگر حکم دیا کہ بارگاہ میں حاضر رہیں۔

القضايا من الامصار فينظر فيها ويامر ما يجب به ان يؤمر۔ فلم يزل مقيما عنده ببغداد لا يأذن له في الانصراف الى الكوفة حتى مات بها۔

تاکہ مختلف شہروں سے جو حل طلب مسائل اور معاملات آئیں ان پر نگاہ ڈالیں اور مناسب احکام صادر کریں چنانچہ انہی کی خدمت میں وہ مستقل طور پر بغداد رہے، آپ انھیں کوفے واپس ہونے کی اجازت نہیں دیتے تھے تا آنکہ وہیں انھوں نے (یعنی حضرت امام نے) وفات پائی [1]

ایک سیدھی سادی بات کو ان صاحب نے ہیر پھیر سے بیان کیا ہے کہ گویا یہ جبر تھا، حالانکہ یہاں پر امیر المؤمنین کے بغایت اعتماد کے سبب تھا اس خاص اہم دینی ضرورت کے لئے وہ امام اعظم کو موزوں ترین شخص سمجھتے تھے کیونکہ خود امیر المؤمنین کو اپنے ملکی مسائل کے سبب اس طرف توجہ کی فرصت نہ

---

[1] عہدۂ قضا قبول کرنا آسان کام نہیں اسی لئے ہمارے بہت سے ائمہ قاضی بننے سے گریز کرتے کہ دو آدمیوں کے مابین فیصلہ کرنا اتنا سخت کام ہے کہ حسب روایت احمد وابی داؤد وترمذی وابن ماجہ من جعل قاضیا بین الناس فقد ذبح بغیر سکین (جس شخص کو لوگوں کے مابین قاضی بنایا گیا تو گویا اسے چھری کے بغیر ذبح کر دیا گیا) وقائع تاریخی میں ہمارے بعض ائمہ کا قاضی بننے سے انکار اسی خوف وخشیت کی بنا پر تھا نہ کہ اس لئے جو ہوا پرست لوگوں نے بیان کیا ہے کہ وہ حکومت سے تعاون کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اور جنھیں اپنے اوپر اعتماد تھا انھوں نے یہ عہدہ قبول کیا ورنہ ہمارا عدلیہ اہل عالم کے لئے نمونہ کیسے بنتا۔

۳۔ تحریری کام حضرت امام کے سب سے چھوٹے شاگرد امام محمد بن حسن رح آپ کے قیام بغداد کے زمانے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ آپ نے امور دفاع پر اپنی دونوں کتابیں سِیَر کی املاء کرائیں۔ حکومت اسلامیہ کیلئے ایسی ایک منضبط تالیف کی سخت ضرورت تھی۔ چنانچہ سلطان الملک المعظم رح نے السہم المصیب میں بیان کیا ہے (ص ۶۶ طبع دیوبند)

فان ابا حنیفۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ املیٰ محمداً رحمہ اللہ تعالیٰ کتابی السِیَر وذکر فیھما من امور الجھاد ووصایا الامراء وما ینبغی لھم فعلہ وما ینبغی ان یفعلہ اھل الثغور وقسمۃ الغنائم مالم یسبقہ الیٰ جمعہ احدٌ ولم یجمع مثلہ بعدہ احدٌ

(امام) ابوحنیفہ رض نے (امام) محمد رح کو سیر کی دونوں کتابیں املاء کرائیں ان دونوں میں آپ نے جہاد کے مسائل بتائے اور امراء کے وہ فرائض جن پر عمل انکے لئے ضروری ہوتا ہے نیز وہ باتیں جو سرحدی علاقوں کے لوگوں پر واجب ہیں اور غنیمتوں کی تقسیم کے طریقے بتائے اس انداز میں کہ نہ ان سے پہلے کسی نے اس طرح جمع کئے تھے اور نہ انکے بعد کوئی اس طرح جمع کر سکا۔

امام محمد رح امام اعظم رح کے سب سے چھوٹے شاگرد ہیں آپ کے بعد انھوں نے بقیہ علوم کی تکمیل امام ابو یوسف رح اور امام اوزاعی رح۔ امام مالک رح سے کی۔ امام محمد کی پیدائش ۱۳۵ھ کی ہے یعنی تعمیر بغداد کے وقت ۱۴۵ھ میں آپ دس برس کے تھے۔ امام اعظم رح کی وفات ۱۵۰ھ میں ہوئی اور اسوقت شہر کی فصیل تیار ہو چکی تھی۔ اگر بارہ چودہ برس کی عمر میں امام محمد رح نے یہ دونوں کتابیں اپنے شیخ کی املاء سے لکھیں تو یہ بات ۱۴۷ھ سے ۱۵۰ھ کے درمیان

کی ہوگی۔ اس زمانہ میں اعلیٰ تعلیم کے لئے بارہ چودہ برس ہی کی عمر کافی ہوا کرتی تھی اور سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں رسمی تعلیم مکمل ہو جاتی تھی۔

کتاب الآثار

ظاہر ہے کہ جب ۱۲۳ھ میں فقہ اسلامی کو تدوین کتابی میں لانے کا کام شروع ہوا، تو اس کے لئے بنیادی طریقہ یہی تھا کہ ارشادات نبویہ اور آثار صحابہ کو فقہی ابواب کے مطابق مرتب کیا جائے اور پھر مسائل کا استخراج ہو۔ چنانچہ امام اعظمؒ نے اسی کی طرح ڈالی۔ سیوطیؒ کا بیان ہے (تبییض الصحیفۃ فی مناقب ابی حنیفۃ)

من مناقب ابی حنیفۃ التی انفرد بہا انہ اول من دوّن علم الشریعۃ ورتبہ ابوابًا ثم تبعہ مالک بن انس فی ترتیب الموطاء ولم یسبق ابا حنیفۃ احدٌ۔

ابوحنیفہ کے مناقب میں یہ اچھوتی بات ہے کہ سب سے پہلے انھوں نے علم شریعت مدوّن کیا اور فقہی مسائل کے مطابق اس کے باب متعین کئے پھر انہی کی پیروی میں موطا کی ترتیب مالک بن انس نے کی۔ یہ کام ابوحنیفہ سے پہلے کسی نے نہیں کیا تھا۔

سیوطی کا یہ بیان محل نظر ہے۔ جب سب نے ایک ہی سال کام شروع کیا اور ایک دوسرے سے سینکڑوں میل کے فاصلے پر رہتے تھے تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ ایک نے دوسرے کی پیروی کی۔ امیر المومنین المنصورؒ نے امام مالکؒ کو جس انداز کا فرمان بھیجا تھا۔ اس کا یہ قدرتی تقاضا تھا کہ وہ آثار کو فقہی ابواب پر مرتب فرمائیں۔ اور جو بھی ذہین شخص فقہ کی کتابی تدوین کرے گا اسے لازماً سب سے پہلے احادیث کو فقہی ابواب پر مرتب کرنا ہوگا۔ امام اعظمؒ کا یہ ذہن رسا تھا کہ یہی طریقہ آپ نے اختیار کیا۔ اور عجب نہیں کہ خود امیر المومنین

موصوف نے انھیں بھی ایسی ہدایت بھیجی ہو جیسی امام مالکؒ کو بھیجی۔ قیاس کو حدیث پر مقدم نہ رکھنے کی ہدایت میں ایسے ایک فرمان کا اشارہ ملتا ہے اگرچہ تاریخ میں مذکور نہیں۔ لیکن یہ بات سمجھ میں خود بخود آجاتی ہے کہ ہزاروں میل کے فاصلے پر رہنے والے دو ایک آدمی بیک وقت کام شروع کریں اور ان دونوں کا طریقہ ایک ہی ہو، یہ تو ہو نہیں سکتا جب تک دونوں کو اوپر سے یکساں ہدایات بیک وقت نہ ملی ہوں۔

امام صاحب کی کتابیں

امام صاحب کو تحریری کام کرنے کے لئے کوفے میں صرف دو برس ملے، اس لئے آپ نے کتاب الآثار کا خاکہ ہی مرتب کیا ہوگا۔ بعض لوگوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جو مغالطہ سیوطی کو لگا اسے صحیح کر دکھائیں اور یہ یاد کرانا چاہیں کہ کتاب الآثار امام اعظمؒ کی زندگی ہی میں اور خود انہی کے ہاتھوں کتابی صورت اختیار کر چکی تھی۔ حالانکہ یہ تصور قابل قبول نہیں۔

صحیح صورت حال یہ ہے کہ کتاب السیر ہو یا کتاب الآثار یا امام صاحب کی طرف منسوب کوئی دوسری کتاب ہو ان میں سے کسی ایک کو مدوّن کتاب کی صورت ان کی زندگی میں نہیں دی جا سکی تھی۔ تدوین و تالیف و تصنیف کا سب کام آپ کے بعد آپ کے عظیم المرتبت شاگردوں کے ہاتھوں انجام پایا اور اس وقت جب وہ خلافت اسلامیہ کے اہم مناصب پر فائز ہوئے۔ الملک المعظم رحمہ اللہ نے کتاب السیر کی جو توصیف کی ہے یا سیوطی نے کتاب الآثار کی، یہ دراصل تعریف و توصیف امام محمدؒ کی سعی مشکور کی ہے جیسا کہ ہم آگے تصریح کریں گے۔ یہاں ہم ایک اور مغالطے پر متوجہ کرتے ہیں۔ امام طحاویؒ نے بسند متصل اسد بن فرات کا یہ بیان نقل کیا ہے۔

كان اصحاب ابي حنيفة الذين دوّنوا الكتب اربعين رجلاً وكان في العشرة المتقدمين ابو يوسف، زفر، وداؤد الطائي واسد بن عمرو، ويوسف بن خالد السمتي، ويحيى بن زكريا بن ابي زائدة وهو الذي كان يكتبها لهم ثلاثين سنة

ابو حنیفہؒ کے وہ اصحاب جنہوں نے کتابیں مدوّن کیں چالیس حضرات تھے ان میں اولین درجہ جن دس کا ہے ان میں ابو یوسف، زفر، داؤد الطائی، اسد بن عمرو، یوسف بن خالد السمتی، یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ اور یہی یحییٰ ہیں جو ان کتابوں کو ان کے لئے تیس برس تک لکھتے رہے۔

اس بیان میں کئی حضرات کے اسماء گرامی رہ گئے ہیں مثلاً عبداللہ بن المبارک (م ۱۸۱ھ) امام حفص بن غیاث (م ۱۵۱ھ) اور امام وکیع بن الجراح ۱۹۶ھ جو امام شافعی اور امام احمدؒ کے استاذ ہیں) علامہ شبلیؒ نے مذکورہ بالا روایت نقل کرکے اعتراض کیا ہے کہ یحییٰ بن زکریا جو ۱۲۰ھ میں پیدا ہوئے وہ ۱۵۰ھ تک جو امام اعظم کا سال وفات ہے یہ کام تیس برس کیسے انجام دے سکتے تھے، علامہ شبلیؒ جیسے زبانہ شخص کو یہ مغالطہ کیوں ہوا اور اس روایت سے انھوں نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ یہ سب تحریری کام ان حضرات نے امام اعظمؒ کے حضور انجام دیا تھا۔ یہاں تو بیان یہ کیا گیا ہے کہ امام صاحب کے اصحاب میں جن حضرات نے تالیف و تصنیف کا کام کیا وہ یہ ہیں۔ ہمارے زمانے کے بزعم خود ایک بڑے مفکر اسلام صاحب نے بھی امت کو یہی مغالطہ دینے کی کوشش کی ہے کہ امام صاحب نے ایک غیر سرکاری مجلس قانون ساز بنائی تھی۔ اور تیس برس کے اندر انھوں نے قانون اسلام مدوّن کرکے رکھ دیا۔ جو پچاس برس کے اندر خلافت عباسیہ میں سرکاری حیثیت حاصل کر گیا ایک

سیدھی بات کو اس طرح کج کر کے غلط تاثر دینے کی کوشش کی گئی۔ روایت میں کہاں ہے کہ امام صاحب کے سامنے بیٹھ کر یہ حضرات آپ کے ارشادات مدوّن کیا کرتے تھے۔ بیان تو صرف اتنا ہے کہ امام اعظمؒ کے اجلّہ تلامذہ جنھوں نے فقہ اسلام پر کتابیں لکھیں وہ یہ حضرات تھے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ سب کام امام صاحب کی وفات کے بعد ہوا اور پھر کچھ استبعاد نہیں رہتا کہ یحییٰ بن زکریا نے تیس برس تک ان حضرات کی خدمت میں حاضر رہ کر تصنیف و تالیف میں کتابت کے ذریعہ، ان کا ہاتھ بٹایا ہو۔ امام صاحب کی طرف منسوب کتابوں کے کئی کئی نسخے ہیں۔ ان میں امام صاحب کے علاوہ دوسرے بزرگواروں کے اقوال کا مذکور ہونا، اور روایات کی کمی بیشی خود دلیل ہے کہ یہ تصانیف بعد کی ہیں

کتاب الآثار کے نسخوں میں امام زفرؒ امام ابو یوسفؒ امام محمدؒ امام حسن ابن زیاد لؤلؤی کے نسخے زیادہ مشہور ہیں۔ ان کے مطالعے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر بزرگوار نے اپنے حفظ اپنے درک اور اپنے فقہی رجحان کے مطابق امام اعظمؒ کی مرویات مدوّن فرمائی ہیں۔ اس طرح یہ تصانیف ان بزرگواروں کی ہیں، نہ کہ امام صاحب کی۔ ان میں سب سے اہم امام محمدؒ کی کتاب الآثار ہے۔ اسی طرح سیر کی دونوں کتابیں جو امام اعظمؒ نے، امام محمدؒ کو بغداد میں املا کرائی تھیں۔ ان کی تالیف امام محمدؒ نے اپنی تمام تصانیف کے بعد کی اور یہ امر متفق علیہ ہے۔ گویا وہ ہیں تو امام صاحب کے املا پر مبنی مگر انھیں کسی حیثیت سے امام صاحب کی تصنیف نہیں کہا جا سکتا۔ وہ امام محمدؒ ہی کی تصنیف کردہ تسلیم کی جائیں گی۔

امام محمدؒ کی شان یہ ہے کہ کتاب الآثار کی طرح انھوں نے امام مالکؒ سے الموطا کی بھی روایت کی ہے اور اس کا باقاعدہ درس دیتے تھے لیکن اس

کتاب کو مؤطا امام مالکؒ بروایت امام محمدؒ نہیں کہا جاتا۔ بلکہ مؤطا امام محمد کہتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس میں محقق امام مالکؓ ہی کی مرویات نہیں ہیں بلکہ امام اعظمؒ کا مذہب بھی برابر بیان کیا ہے اور اگر اپنے مذہب کے مطابق امام مالکؒ کی کوئی روایت معمول بہا نہ ہو تو حنفی زاویہ نگاہ سے اس کو دلیل دیتے ہیں۔ یہی حال کتاب الآثار کا ہے کہ اس میں امام اعظم کے علاوہ دوسرے شیوخ سے بھی استفادہ کیا گیا ہے یعنی صحیح بات یہ ہے کہ دونوں کتابیں امام اعظمؒ یا امام مالکؒ کی مرویات پر مبنی خود امام محمدؒ کی اپنی فقہ کی کتابیں ہیں۔ اسی لئے ان کی نسبت انہی کی طرف ہے اور ہونی بھی چاہیئے اور یہی وجہ ہے کہ مؤطا امام مالکؒ اس کتاب کو کہتے ہیں جو یحیی المصمودیؒ کی روایت پر مبنی امت میں متداول ہے اور اس میں امام مالکؒ کے علاوہ کسی دوسرے کی روایت نہیں۔

یوں اہل تحقیق کا قول بالکل صحیح ہے۔ امام اعظمؒ کی اپنی کوئی تصنیف دنیا میں نہیں۔ آپ کی فقہی آراء اور آپ کی روایت کردہ احادیث سب مدوین آپ کے شاگردوں نے اس وقت کی جب وہ خلافت عباسیہ کے اہم کارکن بن چکے تھے۔

فقہ حنفی

امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کی کتابیں بتاتی ہیں کہ وہ مقلد نہیں تھے۔ بلکہ مجتہد مطلق تھے۔ یہ اور بات ہے کہ انکا بنائے علم چونکہ امام اعظمؒ کے فیوض پر مبنی تھا۔ اس لئے لازماً اس کا رنگ حنفی رہا لیکن انھوں نے جگہ جگہ اپنے شیخ سے اختلاف بھی کیا ہے، کیونکہ ان کے پیش نظر کوئی خاص مکتبہ نہ تھا بلکہ وہ عالمگیر فقہی نظام مرتب کر رہے تھے امام ابن القیم رحمۃ اللہ نے اعلام الموقعین میں لکھا ہے۔

الدین والفقہ والعلم انتشر فی الامۃ عن اصحاب ابن مسعود، واصحاب زید بن ثابت، واصحاب عبداللہ بن عمرؓ واصحاب عبداللہ بن عباس۔ فعلم الناس عامتہ عن اصحاب ہؤلاء الاربعۃ فاما اھل المدینۃ فعلمھم عن اصحاب زید بن ثابت وعبداللہ بن عمرؓ اما اھل مکۃ فعلمھم عن اصحاب عبداللہ بن عباس واما اھل لعراق فعلمھم عن اصحاب عبداللہ بن مسعود

دین اور فقہ اور علم اس امت میں اصحاب ابن مسعودؓ، اصحاب زید بن ثابتؓ اصحاب عبداللہ بن عمرؓ اور اصحاب عبداللہ بن عباسؓ کے ذریعہ پھیلا۔ عام طور پر لوگوں کا علم انہی چاروں کے اصحاب کے فیوض پر مبنی ہے، اہل مدینہ کو علم حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے اصحاب سے ملا۔ اہل مکہ کو علم حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے اصحاب سے ملا، اور اہل عراق کو علم حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے اصحاب سے ملا

پچھلے صفحات میں گزر چکا کہ علماء کوفہ اور حضرت ابن مسعودؓ کے تلامذہ نے ان اصحاب سے بھی پورا فیض لیا جو کوفہ میں تشریف لائے اور پھر یہ حضرات مدینہ طیبہ بھی حاضر ہوتے رہتے تھے۔ تاکہ حضرت امیر المومنین عمر الفاروق الاعظمؓ اور حضرت ام المومنین عائشہ الصدیقۃ الکبریٰؓ سے بھی اکتساب علم کر لیں۔ اسی طرح امام اعظمؒ نے اپنے کوفی اساتذہ کے علاوہ حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابن عباسؓ کے خاص شاگرد حضرت عطاء بن ابی رباحؒ سے بھی استفادہ کیا۔ علاوہ ازیں قاضی شریحؒ (۸۰ھ) کے سلسلے سے آپ کو امام اہل الرائے سیدنا معاذ بن جبلؓ

سے بھی تیرہ تیں پہنچا

اپنے امام اور شیخ کے اسی منہاج پر ان کے شاگرد بھی چلے۔ چنانچہ امام ابو یوسف نے امام اوزاعی سے فقہ شام پر عبور حاصل کیا اور امام محمد نے امام ابو یوسف کے علاوہ حضرت امام مالک اور امام اوزاعی سے پورا پورا فیض لیا غرض یہ ہے کہ عرف عام میں جسے فقہ حنفی کہا جاتا ہے وہ دراصل فقہ حجاز فقہ شام اور فقہ عراق پر مبنی اسلام کا اولین فقہی نظام ہے جو امام اعظم کے تلامذہ نے اپنے امام کے طریقے پر مدون کیا، مقلدانہ نہیں بلکہ مجتہدانہ اسی لئے امت میں فقہ حنفی سب سے زیادہ مقبول ہوئی۔ اور چونکہ یہ عظیم الشان کام خلفاء عباسیہ کی امامت میں انجام دیا گیا اس لئے تمام عالم اسلام کا مقبول ترین فقہی نظام قرار پایا۔

یہ ہے امیر المؤمنین عبداللہ المنصور عباسی کا وہ کارنامہ جس کے سبب یہ امت ان کے احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی اور قیامت تک جتنے فقہاء علماء و صلحاء اور عوام اس فقہ پر عمل کریں گے ان کے اعمال کے ثمرات و انوار سے امیر المؤمنین موصوف کے درجات بلند تر ہوتے چلے جائیں گے۔ من سن سنۃ حسنۃ فلہ اجرھا و اجر من عمل بھا (جس نے کسی نیک کام کی بنیاد رکھی اسے اس کا ثواب ملیگا اور ان لوگوں کا ثواب بھی جو اس پر عمل پیرا ہوں)۔

مودودی صاحب جیسے لوگوں نے جہاں یہ خلاف واقعہ بات کہی ہے کہ فقہ حنفی کی تدوین خود امام اعظم نے ایک غیر سرکاری مجلس آئین ساز بنا کر اپنے شاگردوں کے تعاون سے اپنی زندگی ہی میں کر دی تھی وہاں انھوں نے یہ لغو بات بھی کہی ہے کہ یہ فقہ اپنی پشت پر کسی سرکاری قوت کے بغیر امت میں

مقبول ہوگئی۔ جو لوگ صحابہ کرامؓ کے اجماع سے منہ موڑ کر اپنے خود ساختہ اصول
قواعد کے تحت اموی اور عباسی خلافتوں کی حجیت پر حرف لانا چاہتے ہیں
اور واقعات سے آنکھ بند کرکے یہ خیالی تضاد قائم کرنا چاہتے ہیں کہ خلفاء اسلام
اور علماء و فقہاء امت کے مابین تعاون و احترام و یک جہتی کا فقدان تھا
وہ دعوت محمدیہ کے فروغ اور ملت اسلامیہ کے ارتقاء کو غلط رنگ میں
پیش کرکے یوں امت کے قلوب و اذہان کو اسلاف کرام کی طرف سے مکدر
کرنے کی سعی نامشکور کی معصیت میں مبتلا ہیں، ان کی سمجھ میں اتنی بات
نہیں آتی کہ کوئی تشریعی نظام اس وقت تک نافذ نہیں ہو سکتا جب تک
اسکے عملاً نافذ کئے جانے کی خاطر اس کی پشت پر سیاسی قوت نہ ہو اور وہ
قوت ایسی ہونی چاہیئے کہ قوم اس پر صمیم قلب سے اعتماد کرتی ہو۔ قرآن
مجید میں بھی احکام اسی وقت نازل ہوئے جب مدینہ طیبہ میں اسلامی
حکومت قائم ہوگئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نفاذ شریعت کی
سیاسی طاقت حاصل ہوئی۔ جو سیاسی نظام قوم میں نامقبول ہوگا
اور ملت اسلامیہ مجموعی حیثیت سے اس سیاسی نظام کو دل کی گہرائی سے
اپنا ملی نظام نہیں سمجھے گی تو ناممکن ہے کہ اس حکومت کے جاری کردہ آئین
دائمی طور پر رائج ہو سکیں جونہی حکومت ہٹے گی اس کے قوانین بھی منسوخ
ہو جائیں گے۔ پوری تاریخ انسانیت اس پر گواہ ہے۔

لیکن ہم دیکھتے یہ ہیں کہ حکومتیں بدلیں اور قسم قسم کے سیاسی مدّ و جزر
سے براہ راست دوچار ہوئی۔ مگر وہ فقہی نظام جو امیر المؤمنین المنصورؒ اور
ان کے اخلاف کرام کی نگرانی اور سرپرستی میں مدوّن ہوا۔ وہ آج تک اسی طرح
مقبول چلا آرہا ہے۔ یہ کیسی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ اموی اور عباسی خلافتیں

ہم عصر امت کے نزدیک صحیح معنی میں دعوت محمدیہ کی نمائندہ حکومتیں تھیں اور امت ان کی اطاعت اور ان سے دلی وابستگی کو تقاضائے ایمان جانتی تھی۔ اسی لئے وہ تمام تحریکیں ناکام ہوئیں جو ان خلافتوں کی دینی اور آئینی حیثیت ختم کرنے کے لئے جاری کی گئیں۔ اور وہ سب افراد فنا کے گھاٹ اتر گئے جو اپنے تخریبی عزائم کے تحت کسی متفق علیہ خلیفہ کے خلاف بغاوت میں کھڑے ہوئے۔ لوگ اپنے تخریبی عزائم کے تحت کچھ بھی کہتے رہیں۔ مگر تاریخی حقیقت یہی ہے کہ دین مبین اپنے تمام (کلیات) وجزئیات کے ساتھ عہد بعہد نظام خلافت ہی کے تحت علماء و فقہاء امت نے مدوّن کیا۔ اور یہ اسی باہمی تعاون، واعتماد واحترام کا نتیجہ تھا۔ جو حکومت قائمہ اور فقہاء امت کے مابین ہمیشہ قائم رہا۔

مکتبۂ حنفیہ چونکہ ہمارے پیش نظر صرف امام ابوحنیفہؒ کے مواقف ہیں اور ان کے ذیل میں آپ کے تلامذہ کے، اس لئے دوسرے ائمہ کا اگر ذکر آگیا ہے یا آگے آئے تو محض ضمناً ہوگا۔ سطور بالا سے واضح ہو گیا ہوگا کہ:-

۱۔ امام ابوحنیفہؒ پوری طرح جماعت سے وابستہ تھے اور فرقہ وارانہ تصورات کی ان کے ہاں کوئی گنجائش نہ تھی۔ وہ اپنی تمام صلاحیتوں کے ساتھ وحدت امت برقرار رکھنے کے لئے حکومت قائمہ سے اپنے تعلقات یگانگت پر ہمیشہ ثابت قدم رہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک اموی اور عباسی خلافتیں صحیح بنیاد پر قائم تھیں اور یہ ان کا ملّی فرض تھا کہ امام جماعت سے پوری طرح وابستہ رہیں اور ان تمام حرکتوں سے اپنا دامن بچائے رکھیں جن سے وحدت ملت پاش پاش ہوتی ہو۔ اور امت کا کلمہ متفرق ہوتا نظر آئے

انکا یہ مذہب شروع سے تھا اور آخر تک رہا۔ یہی مذہب انھیں اپنے اساتذہ سے ملا تھا اور اسی کی تلقین انھوں نے اپنے تلامذہ کو کی۔ جس پر انھوں نے عمل کیا اور خلافت قائمہ کے دست و بازو رہے۔

۲۔ حضرت امام اعظمؒ کے زمانے میں زید بن علی بن الحسینؓ وغیرہ نے اموی خلافت میں اور محمد الارقط بن عبداللہ حسنی وغیرہ نے عباسی خلافت میں جو خروج کیا۔ امام صاحب اور دوسرے ہم عصر ائمہ نے ان خروجوں اور بغاوتوں سے قطعاً کوئی تعلق نہیں رکھا اور وہ سب روایتیں عقلاً و نقلاً باطل ہیں جو ہوا پرست لوگوں نے اس ضمن میں بیان کی ہیں۔

۳۔۔۔ حکومت قائمہ اموی ہو یا عباسی قواعد دینیہ کے تحت تمام علماء و فقہاء عصر کا پورا احترام کرتی تھی۔ ایسی تمام روایات صدیوں بعد کے لوگوں کی خود ساختہ ہیں جن سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ خلفاء اور علماء کے مابین دوئی تھی، اور وہ ایک دوسرے کے خلاف حریفانہ اور معاندانہ جذبات رکھتے تھے، یہ کرامت ان خلفا کی ہے کہ ہر ایسی روایت اپنا بطلان خود ثابت کر دیتی ہے۔

تلامذۂ امام

امام اعظم ابوحنیفہؒ نے جس طرح ہدایات ربانیہ اور فرمودات نبویہ کے مطابق خلیفۂ عصر سے اپنے تعلقات یگانگت استوار رکھنا اور ان کی اطاعت کرنا اپنا فریضہ ملی جانا اسی طرح ان کی اجلہ تلامذہ کا طریقہ کار تھا۔ اور اسی باہمی ربط و صفا کی برکت تھی کہ امت مسلمہ نے اپنے ارتقائی منازل طے کئے۔

۱۔ امام زفرؒ امام صاحب کے سب سے بڑے شاگرد اور جانشین امام زفرؒ ہیں۔ جو امام صاحب کی زندگی میں بصرے کے قاضی مقرر ہوئے تھے اور اس

خدمت سے وہ اس وقت مستعفی ہوئے جب اپنی شیخ کی وفات پر انکی جانشینی
کی ذمہ داری ان پر آپڑی۔ جس کے فرائض انھوں نے اپنی وفات تک آٹھ
برس انجام دئے۔ ابن عبدالبر نے الانتقاء میں ان کے قاضی بننے کی دلچسپ
روئداد نقل کی ہے (ابوزہرہ - ابوحنیفہ ص ۲۱۸)

جب حکومت نے انھیں بصرے کا قاضی مقرر کیا (یعنی امیرالمومنین
المنصور نے) تو امام ابوحنیفہؒ نے ان سے فرمایا "ہمارے اور اہل
بصرہ کے مابین جو اختلافات ہیں اور وہ لوگ ہم سے حسد کرتے
ہیں، اس کے پیش نظر مجھے امید نہیں کہ تم اپنے فرائض کامیابی
سے انجام دے سکو گے۔" لیکن امام زفر توکلاً علی اللہ وہاں
گئے اور اپنا عہدہ سنبھال لیا۔ بصری علماء ان کے پاس
آنے لگے اور مناظرے کا سلسلہ شروع ہو گیا جب امام
زفر مخاطب کو فقہی مسائل میں قائل کر لیتے تو فرماتے "یہ ہے
ابوحنیفہ کا قول" لوگ تعجب سے کہتے "ابوحنیفہ کے علم میں
اتنی گہرائی ہے؟" تو آپ فرماتے ہیں "اس سے بھی زیادہ۔"

یوں رفتہ رفتہ وہ تعصب جاتا رہا۔ اب حکومت کے ساتھ تعاون
امیرالمومنین موصوف کی فرماں برداری کی اس سے بڑی دلیل کیا ہو سکتی ہے
کہ امام زفرؒ نے اس علاقے کا قاضی بننا منظور کر لیا۔ جہاں کا ماحول ان کی خلاف
تھا۔ یعنی انھوں نے اسے اپنا دینی فریضہ جانا کہ حالات موافق ہوں یا مخالف
امیرالمومنین کا فرمان بجا لانا چاہیئے۔

۲۔ امام ابو یوسفؒ امام زفر کے بعد درجہ امام ابو یوسفؒ کا
امیرالمومنین المہدی عباسیؒ نے آپ کو شرقی بغداد کا قاضی مقرر کیا۔ پھر یہی عہدہ

ان کے بعد امیر المؤمنین الہادیؒ کے زمانے میں رہا۔ امیر المؤمنین ہارون الرشیدؒ کے عہدِ زریں میں آپ کو قاضی القضاۃ بنا دیا گیا۔ شیخ ابو زہرہ کہتے ہیں۔
(ابو حنیفہ ص ۱۹۶)

ولقد ولی القضاء لثلاثۃ من الخلفاء للمہدی ثم للہادی ثم للرشید ویقول ابن عبد البر کان الرشید یکرمہ ویجلہ وکان عندہ خطیبا مکینا۔

وہ تین خلفاء کی طرف سے قاضی رہے یعنی المہدی، الہادی اور الرشید کے۔ ابن عبد البر کہتے ہیں کہ الرشید انکی بہت عزت و احترام کرتے تھے اور وہ ان کے ہاں بہت مقتدر اور صاحبِ اثر تھے۔

اس سے پہلے اسلام میں قاضی القضاۃ کا کوئی عہدہ نہ تھا اور یہ شرف امام ابو یوسفؒ کا ہے کہ آپ ہی سب سے پہلے قاضی القضاۃ بنے۔ اسی عہدے کی برکت تھی کہ تمام عالم اسلام میں امام اعظمؒ کے تلامذہ نے اسلام کا نظام فقہ حنفی کے مطابق منظم کیا۔ کیونکہ صحابۂ کرام سے لے کر اپنے دور تک کے تمام فقہی مکتبہائے فکر سے اس کی تدوین میں پورا پورا استفادہ کیا گیا تھا۔ اسی لئے ہر علاقے کے لوگوں نے خوش دلی کے ساتھ اس اجتماعی فقہ کو درآمد کر لیا۔ اسی دوران آپ نے وہ معرکۃ الآراء کتاب لکھی جو آپ کی کتاب الخراج کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی تالیف امیر المؤمنین ہارون الرشیدؒ کی فرمائش پر تھی۔ اس کے مقدمے میں خود فرماتے ہیں۔

ان امیر المؤمنین ایدہ اللہ تعالٰی سألنی ان اضع کتابا جامعا

امیر المؤمنین نے، اللہ تعالیٰ ان کا حامی و ناصر ہو، مجھ سے فرمائش کی ہے کہ میں ایک جامع کتاب لکھوں

گویا جس طرح امیر المؤمنین المنصورؒ کی فرمائش پر امام مالکؒ نے موطا

شریف کی تدوین کی اور امام اعظمؒ نے سیر کی کتاب املاء کرائی اسی طرح امیر المومنین ہارون الرشیدؒ کے فرمان کی پزیرائی میں امام ابو یوسفؒ نے کتاب الخراج لکھی اسی عہد مبارک میں امام محمدؒ نے اپنی عظیم الشان کتابیں لکھیں۔ امام ابو یوسف کی وفات ۱۸۲ھ میں ہوئی نام یعقوب تھا سلسلۂ نسب یوں ہے۔ یعقوب ابو یوسف بن ابراہیم بن حبیب بن سعد بن حبتہ بجلیؒ امام ابو یوسف کے فرزند یوسف اپنے والد ماجد کی حیات ہی میں عہدہ قضا پر مقرر تھے۔

۳۔ امام محمدؒ:۔ امام محمدؒ نے اپنے شیخ امام اعظمؒ کے بعد امام ابو یوسفؒ، امام مالکؒ اور امام اوزاعیؒ سے علوم کی تکمیل کی۔ پھر امیر المومنین ہارون الرشیدؒ کے ایک قاضی مقرر ہوئے اور اسی منصب پر فائز ہونے کے بعد اپنی کتابیں لکھیں اور بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ عرف عام میں جسے فقہ حنفی کہتے ہیں اس کی تکمیل کا سہرا آپ کے سر ہے امام محمدؒ اور امام کسائیؒ نے ۱۸۹ھ میں ایک ہی دن وفات پائی امیر المومنین ہارون الرشیدؒ نے دونوں کی نماز جنازہ خود پڑھائی اور سرکاری اعزاز کے ساتھ ان دونوں عظیم ہستیوں کی تدفین کے بعد حسرت سے فرمایا "آج میرے ہاتھوں فقہ اور نحو دونوں زیر زمین ہیں"۔ امام محمدؒ کی کنیت ابو عبداللہ تھی۔ شیبان سے نسبِ ولا کی بناء پر محمد الشیبانی کہلائے۔

۴۔ ابن المبارکؒ:۔ امام اعظمؒ کے خاص شاگرد ہیں صاحب تصنیف ہونے کے علاوہ ایسے جامع الکمالات تھے کہ رہتی دنیا تک یہ امت آپ پر فخر کرے گی۔ امیر المومنین ہارون الرشیدؒ کے ساتھ آپ کے تعلقات بہت گہرے تھے۔ ایک مرتبہ ۱۷۹ھ میں آپ نے طرطوس کے جہاد میں شرکت کی۔ جہاد بالقلم اور جہاد بالنفس سے آگے بڑھ کر جب اپنی

امام کی معیت میں جہاد بالسیف کیا اور اسکی عظمت و برکت اور انوار آپ پر منکشف ہوئے تو اپنے اور امیر المؤمنین کے عزیز ترین دوست حضرت فضیل بن عیاضؒ کو حسب ذیل اشعار لکھ کر بھیجے (امام سبکی طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۱ ص ۱۵۱)

یَا عَابِدَ الْحَرَمَیْنِ لَوْ اَبْصَرْتَنَا — لَعَلِمْتَ اَنَّكَ فِی الْعِبَادَةِ تَلْعَبُ

اے حرمین میں عبادت کرنیوالے اگر آپ ہمیں دیکھتے تو جان لیتے کہ آپکی عبادت ایک کھیل ہے

مَنْ کَانَ یَخْضِبُ خَدَّهٗ بِدُمُوْعِهٖ — فَنُحُوْرُنَا بِدِمَائِنَا تَتَخَضَّبُ

اگر کوئی اپنے رخسار آنسوؤں سے رنگتا ہے۔ تو ہم اپنے خون سے اپنے گلے رنگتے ہیں

اَوْ کَانَ یُتْعِبُ خَیْلَهٗ فِیْ بَاطِلٍ — فَخُیُوْلُنَا یَوْمَ الْکَرِیْهَةِ تَتْعَبُ

یا اپنے گھوڑوں کو فضول کاموں میں تھکاتا ہو۔ تو ہمارے گھوڑے میدانِ کارزار میں تھکائے جاتے ہیں۔

رِیْحُ الْعَبِیْرِ لَکُمْ وَنَحْنُ عَبِیْرُنَا — رَهَجُ السَّنَابِكِ وَالْغُبَارُ الْاَطْیَبُ

تمہارے لئے خوشبو گلال کی ہے اور ہمارا گلال اڑتی ہوئی مٹی اور پاک غبار

وَلَقَدْ اَتَانَا عَنْ مَقَالِ نَبِیِّنَا — قَوْلٌ صَحِیْحٌ صَادِقٌ لَا یُکْذَبُ

ہمیں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں یہ صحیح اور سچا قول پہنچا ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

لَا یَسْتَوِیْ وَغُبَارُ خَیْلِ اللّٰهِ فِیْ — اَنْفِ امْرِئٍ وَدُخَانُ نَارٍ تَلْهَبُ

اللہ کی راہ میں گھوڑوں سے اٹھتا ہوا غبار جو ایک آدمی کی ناک میں جائے اور جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ کا دھواں دونوں یکجا نہیں ہو سکتے۔

هٰذَا کِتَابُ اللّٰهِ یَنْطِقُ بَیْنَنَا — لَیْسَ الشَّهِیْدُ بِمَیِّتٍ لَا یُکْذَبُ

یہ اللہ کی کتاب ہے جو فیصلہ سناتی ہے کہ شہید مرتا نہیں اور یہ بات جھٹلائی

نہیں جا سکتی۔

امیر المؤمنین موصوف کو ان سے اتنی محبت تھی کہ ان کی وفات پر مجلس عزا منعقد کی، لوگ آ کر امام ابن المبارکؒ کی وفات پر تعزیت پیش کرتے امام ابن المبارکؒ کا ایک مشہور قصیدہ ہے جس میں آپ نے فرقہ بازوں کی عقائد و اعمال سے بیزاری ظاہر کر کے جماعت اور اس کے امام سے وابستگی کو ضروریات دین میں بتایا ہے اور یہ کہ خلافت ہی کے ذریعہ دین مبین کی حفاظت ہو سکتی ہے۔ اس طویل قصیدے کے دو شعر یہ ہیں۔

اللّٰہُ یَدْفَعُ بِالسُّلْطَانِ مُعْضِلَۃً ؛ عَنْ دِیْنِنَا رَحْمَۃً مِّنْہُ وَرِضْوَ

اللہ تعالیٰ خلیفۂ وقت کے ذریعہ اپنی رحمت اور رضا سے ہمارے دین کی ہر مشکل کو رفع فرماتا ہے۔

لَوْلَا الْاَئِمَّۃُ لَمْ تَاْمَنْ لَنَا سُبُلٌ ؛ وَکَانَ اَضْعَفُنَا نَھْبًا لِّاَقْوَانَا

اگر خلفاء اسلام نہ ہوتے تو ہمارے لئے ہمارے راستے محفوظ نہ رہ سکتے اور ہمارے کمزور لوگ ہمارے زبردستوں کا شکار بن جاتے۔

یعنی ہماری دینی اور دنیوی تمام ترقیاں، ملت کا تحفظ وارتقاء اور ظاہری و باطنی فتنوں کے شر سے محفوظ رہنے کی سبیل نظام خلافت کے استحکام پر مبنی ہے۔

۵۔ قاسم بن معنؒ۔ یہ امام اعظمؒ کے اجلہ تلامذہ میں ہیں حضرت ابن مسعودؓ کی اولاد میں تھے امام صاحب کی زندگی ہی میں امیر المؤمنین المنصور کی طرف سے کوفے کے قاضی رہے۔ مگر منصب کی تنخواہ قبول نہیں کی اور رضاکارانہ فرائض انجام دئے۔ امام اعظمؒ ان کے متعلق فرمایا کرتے تھے " انتم مسار قلبی وجلاء حزنی" تم میرے دل کے سرور ہو اور دوائے قلب محزون

تمام اصحاب السنن کے مشائخ میں ہیں بعض کے نزدیک ۱۷۵ھ میں وفات پائی اور بعض نے سال وفات ۱۵۵ھ بتایا ہے۔ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے اور صحیح سال وفات ۱۵۵ھ ہی ہے۔

۶۔ حمّاد بن ابی حنیفہ:۔ امام اعظمؒ کے یہ فرزند جلیل قاسم بن معنؒ کے بعد کوفے کے قاضی ہوئے (م ۱۷۰ھ الفوائد البہیہ فی تراجم الحنفیہ)

۷۔ اسماعیل بن حمّاد:۔ امام صاحب کے یہ پوتے اول شرقی بغداد کے قاضی رہے اور پھر بصرے اور رقے کے (م ۲۱۲ھ) الفوائد البہیہ فی تراجم الحنفیہ)

۸۔ حفص بن غیاثؒ:۔ یہ امام اعظمؒ کے تلامذہ میں ہیں، سفیان ثوری اور ابو یوسفؒ سے بھی استفادہ کیا۔ ان سے جن حضرات نے استفادہ کیا، ان میں امام احمدؒ امام یحییٰ بن معینؒ، امام علی المدینیؒ جیسے بزرگوار ہیں امیر المومنین ہارون الرشیدؒ کے عہد مبارک میں کوفے کے قاضی تھے۔ (م ۱۹۴ھ)

۹۔ حسن بن زیاد لؤلؤی:۔ یہ امام اعظمؒ کے شاگرد ہیں کچھ دن کوفے کے قاضی رہے۔ پھر مستعفی ہو گئے (م ۲۰۴ھ)

۱۰۔ امام اسد بن عمروؒ:۔ یہ بھی امام اعظمؒ کے اجلّہ تلامذہ میں ہیں ان کے متعلق امام ذہبیؒ فرماتے ہیں۔ صحب ابا حنیفۃ و تفقہ علیہ من اھل الکوفۃ فقدم بغداد و تولی قضاء الشرقیہ (اہل کوفہ میں سے انھوں نے بھی ابو حنیفہ کی صحبت اختیار کی اور فقہ پر عبور حاصل کیا پھر بغداد آئے اور شرقی بغداد کے قاضی بنے) بعہد امیر المومنین ہارون الرشیدؒ ۱۹۰ھ میں وفات پائی۔

اصحابِ امام مالکؒ

خلفاءِ کرام کے ساتھ امام اعظمؒ کے باہمی روابط اوپر بیان ہوئے۔ ان کے عظیم المرتبت تلامذہ کا خلافتِ عباسیہ کے اہم مناصب پر فائز ہو کر فقہ اسلامی کی تدوین کرنا بھی ہو چکا۔ اسی طرح امام مالکؒ اور خلفاءِ عباسیہ کے گہرے روابط کا حال بھی لکھا جا چکا۔ اب ہم یہاں صرف چند مالکی حضرات کے اسماءِ گرامی لکھتے ہیں۔

۱۔ ابو مصعب زھری احمد ابن ابی العوفی المدنیؒ۔ امام مالکؒ کے خاص شاگرد ہیں۔ امام نسائی کے علاوہ صحاح کے تمام مصنفوں کو آپ سے بلاواسطہ فیض ہے۔ سنہ ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے اور سنہ ۲۴۲ھ میں وفات پائی۔ مدینہ طیبہ کے قاضی تھے۔ امام ذہبی ان کے متعلق فرماتے ہیں۔ احد الاثبات و شیخ اھل المدینۃ و قاضیھم و محدثھم۔ مسلم الثبوت حفاظ میں ہیں۔ اہل مدینہ کے استاد تھے ان کے قاضی تھے اور ان کے سب سے بڑے محدث تھے۔

۲۔ حارث بن سکینؒ۔ امام مالکؒ کے شاگرد، امیر المومنین المتوکل علی اللہ کے عہد میں مصر کے عہدۂ قضا پر فائز تھے۔

۳۔ عبد اللہ بن الحکمؒ۔ یہ بھی امام مالکؒ کے شاگرد ہیں مصر میں انتظامیہ کے اہم عہدے پر تھے۔ بعہد امیر المومنین المتوکل علی اللہؒ

۴۔ امام شافعیؒ۔ آپ مجتہد مطلق ہیں۔ امام مالکؒ کی شاگرد امام اعظمؒ کے تلمیذ خاص اور وکیع بن الجراح کے بھی۔ امام محمدؒ سے آپ نے بہت استفادہ کیا ہے۔ امام ذہبیؒ فرماتے ہیں (مناقب ابی حنیفۃؒ و صاحبیہ) اما الشافعیؒ فاحتج بمحمد بن الحسن فی الحدیث (امام شافعی حدیث کے بارے میں امام محمدؒ کی روایات کو حجت سمجھتے ہیں) خطیب بغدادی

نے امام شافعیؒ کا قول نقل کیا ہے (تاریخ بغداد، ج ۲ ص ۱۷۶) اَمَنّ النّاس علیَّ فی الفقہ محمد بن الحسن (تخصیص فی الفقہ میں مجھ پر سب سے زیادہ احسان محمد بن الحسن کا ہے) حافظ سمعانی نے بلوغ الامانی میں آپکا یہ قول نقل کیا ہے۔ اعانَنی اللّٰہ برجلین یابن عیینہ فی الحدیث و بمحمد فی الفقہ (اللہ تعالیٰ نے دو بزرگوں کے ذریعہ میری مدد فرمائی حدیث میں ابن عیینہ کے ذریعہ اور فقہ میں محمد کے ذریعہ)

امیر المؤمنین ہارون الرشیدؒ کے قاضیوں میں امام شافعیؒ بھی ہیں۔ اور آپ کے شاگردوں اور ان کے شاگردوں کے سلسلے کے سیکڑوں حضرات صدیوں تک خلافت عباسیہ کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ اگر ان سب کی فہرست مرتب کی جائے تو ایک مجلد ہو۔ امیر المؤمنین المتوکل علی اللہؒ کو آپ سے خاص عقیدت تھی اور اتنی کہ بعض لوگ انھیں شافعی المذہب کہتے ہیں جو صحیح نہیں۔ کیونکہ اس وقت تک خلفاء کسی کی تقلید نہیں کرتے تھے البتہ امیر المؤمنین القادر باللہؒ شافعی المذہب تھے اور شوافع کے صاحب تصنیف ائمہ میں ہیں (طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۳ ص ۱) اسی طرح امیر المؤمنین المسترشد باللہؒ بھی شافعی المسلک تھے۔ نیز بعض دوسرے خلفاء۔ امیر المؤمنین المستضی باللہؒ اور امیر المؤمنین الناصر الدین اللہؒ حنبلی تھے۔

امام احمدؒ۔ آپ بھی مجتہد مطلق ہیں۔ امام ابو یوسفؒ اور امام محمد سے ابن جراحؒ تیسرے رشتہ تلمذ تھا۔ امام ذہبیؒ نے مناقب میں آپ کا یہ بیان نقل کیا ہے۔ اول ماکتبت الحدیث اختلفت الی ابی یوسف القاضی وکتبت عنہ ثم اختلفت بعد الی الناس (سب سے پہلے میں نے جو احادیث

لکھیں تو ان کے لئے قاضی ابو یوسفؒ کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا اور ان سے احادیث نقل کیں پھر دوسرے حضرات کے پاس گیا)" اسی طرح امام محمدؒ اور امام شافعیؒ سے آپ نے اکتساب فیض کیا ہے۔ امیر المؤمنین المعتصم باللہ سے خلق قرآن کے سلسلے میں آپ کا اختلاف ہوا تھا۔ اور اس سلسلے میں لوگوں نے روایات کا ایک انبار لگا دیا ہے جن پر تنقید سے فی الحال ہمیں غرض نہیں۔ البتہ یہ واقعہ ہے کہ اس اختلاف کے بعد آپ سات برس امیر المؤمنین المتوکل علی اللہؒ کے عہد میں زندہ رہے اور اپنے مذہب کی تلقین کی اور وہ مذہب وہ نہیں تھا جو لوگوں نے آپ کی طرف منسوب کر دیا ہے، آپ کا مذہب یہ تھا کہ کلامی مسائل میں گفتگو بے ضرورت ہے اور بدعت یعنی آپ کے نزدیک قرآن مجید کو غیر مخلوق کہنا بھی بدعت تھا اور مخلوق کہنا بھی، آپ اس اعتقاد کو کافی و شافی بتاتے تھے کہ قرآن کلام اللہ ہے اور بس۔ یہ موضوع بھی طویل ہے اور ہمارے ائمہ نے اس پر کافی بحث کی ہے اور ان لوگوں کا قول غلط بتایا ہے جو کہتے ہیں کہ امام احمدؒ قرآن مجید کو غیر مخلوق کہتے تھے اور کہنے والے کو کافر جانتے تھے۔ ملاحظہ ہو "طبقات الشافعیۃ الکبریٰ، ج ۵، ص ۸۰ بذیل مادہ امام عز الدین عبد العزیز بن عبد السلام قدس سرہٗ۔ فرماتے ہیں۔ واحمد بن حنبل و فضلاء اصحابہ و سائر علماء السلف براء الی اللہ مما نسبوہ الیھم واختلقوہ علیھم (احمد بن حنبل اور ان کے فاضل اصحاب اور تمام علماء سلف اس چیز سے بری ہیں جو لوگوں نے ان کی طرف منسوب کر دی ہیں۔ اور ان پر بہتان باندھے ہیں.......)

بہر حال یہ امر مسلّم ہے کہ امیر المؤمنین المتوکل علی اللہؒ سے امام احمدؒ

تعلقات بہت خصوصی تھے اور اکثر امور میں وہ آپ کی رائے لئے بغیر کوئی حکم نہیں کرتے تھے۔ آپ ہی کی رائے کے مطابق امیرالمؤمنین موصوف نے کربلا مصنوعی قبریں جو عرصہ دراز کے بعد بالکل پختہ بنائی گئی تھیں وہاں کی بدعات مشرکانہ رسوم کی بناپر منہدم کرادی تھیں۔ اسی مذہب کے مطابق سلطان ابن سعود نے حرمین شریفین کی قبریں مسمار کرادیں یہی مذہب امیرالمؤمنین عثمان کا تھا جیسا کہ اوپر مذکور ہوا۔ اور یہی مذہب سیدنا عمرو بن العاص کا تھا آپ نے وصیت فرمائی تھی کہ آپ کی قبر مبارک پر نرم کنکریاں ڈال دیجائیں رفتہ رفتہ قبر معدوم ہو جائے۔ دنیا دارالفنا ہے یہاں ثبات کی کوشش بھی لاحاصل ہی رہے گی۔

دیگر ائمہ امام اعظمؒ ان کے تلامذہ اور پھر ان کے وہ تلامذہ جو خود صاحب مذہب اور خود مجتہد مطلق ہیں ان کے اور خلافت قائمہ کے مابین روابط اور باہم تعاون و احترام کا یہ مختصر تبصرہ یوں تو بالکل کافی ہے اور اس کا بین ثبوت کہ خلافت قائمہ اور ائمہ مذاہب کے مابین دوئی نہ تھی خلیفہ امام المسلمین کی قیادت میں امت کا وحدانی نظام تھا جس کے تحت ہر مومن اپنی جگہ اپنے اپنے دائرہ عمل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی آبیاری میں مصروف رہتا تھا اور وحدتِ امت کا تصور دل سے محو نہیں ہونے دیتا تھا۔ اسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجموعی حیثیت سے بھی سب باطل فرقے کوئی حیثیت نہ بنا سکے کہ عددی اعتبار سے امت کے سواد اعظم کے حریف ہو سکیں۔

اب ہم چند اور اکابر امت کا ذکر تازہ کرتے ہیں جنھوں نے نظام خلافت کی دینی حجیت اور خلفاء اسلام سے روابط کا استحکام ایک فریضہ

ملیہ جانا۔

۱۔ حضرت فضیل بن عیاضؒ:۔ مشاہیر اولیاء اللہ میں بڑ اکابر عباد اور اعاظم زہاد میں آپ کا شمار ہے۔ اہلِ حدیث کے ہاں آپ کو ثقۃ ثبت امامٌ (ثقہ اور قابل استناد امام) کہا جاتا ہے۔ آپ امیر المومنین ہارون الرشیدؒ کے خاص احباب میں تھے اور ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا تھا۔ ایک مرتبہ حج کے موقعہ پر آپ نے امیر المومنین کو تشریف لاتے دیکھا تو عبدالرزاق سے فرمایا (تاریخ الخلفاء ص ۲۸۴ طبع مصر)

قال عبد الرزاق کنت مع الفضیل بمکۃ فمر ھارون فقال فضیل الناس یکرھون ھذا وما فی الارض اعز علیّ منہ۔	عبدالرزاق کہتے ہیں، میں فضیل کے ساتھ مکہ میں تھا کہ ادھر سے ہارون کا گزر ہوا، تو فضیل نے فرمایا لوگ انھیں پسند نہیں کرتے مگر میرے نزدیک روئے زمین پر ان سے زیادہ لائق تعظیم و محبت کوئی نہیں۔

عبدالرزاق سے یہ آپ نے اس لئے فرمایا کہ وہ شیعی خیال کے شخص تھے اگرچہ روایات ان کی بعض شرائط کے ساتھ قبول کرلی جاتی ہیں۔ مگر اپنے مخصوص تصورات کی بناء پر امام جماعت کی انکی نگاہوں میں چنداں حرمت نہ تھی ممکن ہے حضرت فضیلؒ کے اس ارشاد سے ان کی کچھ اصلاح ہو گئی ہو۔

۲۔ حافظ اسحٰق بن موسی الانصاریؒ۔ امیر المومنین المتوکل علی اللہ کے زمانے میں نیشاپور کے قاضی تھے، امام مسلمؒ امام ترمذیؒ اور امام ابن ماجہؒ کی استاد امام ذہبی فرماتے ہیں۔ کان من ائمۃ الحدیث وصاحب سنۃ (وہ حدیث کے ائمہ میں ہیں اور عالم سنت (م ۲۴۴ھ)

۳۔ حافظ ابوبکر بن ابی الدنیاؒ۔ بالولاء اموی قریشی ہیں، امام بخاریؒ اور امام ابوداؤدؒ کے شاگرد اور امام ابن ماجہؒ کے استاد ہیں (م ۲۸۱ھ) امیر المؤمنین المعتضد باللہ عباسیؒ اور دوسرے نونہالان خانوادہ خلافت کے اتالیق رہے اور ان کی تربیت کی۔

امام اوزاعیؒ۔ ابونعیم اصفہانیؒ نے حلیۃ الاولیاء میں بڑی تفصیل سے مرجع اہل شام امام اوزاعیؒ اور امیر المؤمنین المنصورؒ کی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ (ج ۶، ص ۱۳۵) مگر اس تفصیل میں جو احادیث حضرت اوزاعیؒ نے بیان کی ہیں ان کی صحت مشکوک ہے اور بعض بالکل بے پایہ ہیں۔ غالباً کسی راوی نے تصرف کیا ہے۔ بہرحال امام اوزاعیؒ فرماتے ہیں۔

بعث الیّ ابوجعفر امیر المؤمنین وانا بالساحل فاتیتہ، فلما وصلت الیہ وسلمت علیہ بالخلافۃ ردّ علیّ واستجلسنی ثم قال ما الذی ابطاء بک عنا یا اوزاعی؟ قلت وما الذی ترید یا امیر المؤمنین قال ارید الاخذ عنکم و الاقتباس منکم۔ قلت یا امیر المؤمنین انظر ولا تجھل شیئاً مما اقولک قال وکیف اجھلہ وانا اسالک	مجھے ابوجعفر المنصور امیر المؤمنین نے طلب کیا میں اس وقت ساحل پر تھا، چنانچہ ان کے پاس گیا جب قریب پہنچا اور خلافت کے آداب بجالایا تو انھوں نے مجھے سلام کا جواب دیا، اپنے پاس بٹھایا اور فرمایا اوزاعی آپ کو ہمارے پاس آنے سے کس چیز نے روک رکھا تھا؟ میں نے عرض کیا امیر المؤمنین آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں فرمایا میں آپ سے کچھ حاصل کرنا اور فیض اٹھانا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا امیر المؤمنین غور کیجیے اور جو کچھ میں آپ سے کہوں اس سے غافل مت ہوجیے۔ فرمایا

عنه وقد وجهت فيه اليك واقد منك له؟ قلت ان تسمعه ولا تعمل به، قال فصاح بي الربيع واهوى بيده الى السيف فانتهره المنصور وقال هذا المجلس مثوبة لا عقوبة۔ فطابت نفسي و انبسطت في الكلام۔

میں غافل کیسے ہو نگا جب کہ میں آپ سے پوچھ رہا ہوں آپ کے پاس قاصد بھیجا اور آپ کو یہاں بلایا۔ میں نے کہا "لو کہ آپ جو سنیں اسپر عمل نہ کریں" اس پر ربیع نے مجھے ڈانٹا اور تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھا تو المنصور نے انھیں جھڑ "یہ محفل جزا کی ہے سزا کی نہیں" تو مجھے اطمینان ہوا اور کھل کر بات کی

جب یہ مجلس ختم ہو گئی اور میں رخصت ہونے لگا تو امیر المؤمنین نے فرمایا

شكرت لك نصيحتك و قبلتها بالقبول والله الموفق للخير والمعين عليه وبه استعين وعليه التوكل وهو حسبي ونعم الوكيل فلا تخلني عن مطالعتك اياي بمثلها فانك المقبول غير المتهم في النصيحة۔ قلت افعل ان شاء الله۔

میں آپکی نصیحت کا شکر گزار ہوں اور میں نے اسے دل سے قبول کیا اللہ تو ہی بھلائی کی توفیق دینے والا ہی اور وہ اس پر مدد کرنے والا۔ میں اسی سے مدد طلب کرتا ہوں اسی پر بھروسہ رکھتا ہوں اور وہی میرے لئے کافی اور بہترین کارساز ہے آپ اپنی توجہات سے مجھے محروم مت رکھئے کیونکہ خیر خواہی میں آپ مقبول ہیں اور متہم نہیں۔ میں نے کہا ان شاء اللہ ایسا ہی کرتا رہوں گا۔

چنانچہ دونوں بزرگوں میں مراسلت ہوتی رہتی تھی اور امیر المؤمنین

موصوف ان کی سفارشات قبول فرماتے تھے۔ یہاں اس کی تصریح نہیں کی کہ امیرالمومنین نے دینی کتابیں لکھنے پر انھیں متوجہ کیا لیکن یہ کام آپنے اسی ملاقات کے بعد کیا تھا۔ جیسا کہ امام ذہبی نے ۲۴۵ھ میں ان کے کام کرنے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مذہب اوزاعی کے ایک جلیل القدر عالم کھنی حافظ رحیم عبدالرحمان بن ابراہیم بن عمرو بن میمون (م ۲۴۵ھ) امام ذہبی نے ان کے متعلق لکھا ہے "حافظ حدیث، فقیہ کبیر ابو سعید اموی بطریق ولاء دمشق کے رہنے والے تھے۔ مذہب اوزاعی کے متبع اور شام کے محدث" امام ترمذی کے علاوہ صحاح کے تمام مؤلف ان کے شاگرد ہیں۔ یہ اموی امام پہلے اردن اور فلسطین میں عرصہ دراز تک قاضی رہے۔ اس کے بعد انکو امیرالمؤمنین المتوکل علی اللہ نے مصر کا قاضی القضاۃ بنایا لیکن یہ عہدہ سنبھالنے سے پہلے آپ وفات پا گئے۔

غرض یہ ہے کہ اہل ہدایت خلافت اسلامیہ اور علماء و فقہاء امت کے مابین منصب خلافت کے استخفاف کے لئے جو روائتیں ذکر کی ہیں، اکابر علماء و خلفاء پر بہتان یا بے تحقیق اور جھوٹی بعد کے مصنفوں نے ان روایات کو بے احتیاطی، یا تعصب کے سبب اپنی کتابوں میں نقل کر دیا ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ ہمارے تمام ائمہ خلیفۂ عصر کے ساتھ تعاون اور ان کے فرائض کی نیز برائی کو شرعی دینیات دین میں سمجھتے تھے جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو وصیت کی ہے۔ اور آپ کے بیسیوں ارشادات صحاح میں مروی ہیں۔ منجملہ ازاں یہ ارشاد مبارک ہے اور صحیح بخاری کتاب الفتن) حضرت حذیفہ رضی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فتنوں کے بارے میں کچھ سوال کئے۔

"یا رسول اللہ ہم جاہلیت اور شر میں تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ ہمارے پاس یہ خیر لے آیا (یعنی اسلام) تو کیا اس خیر کے بعد کچھ شر آجائے گا؟ فرمایا "ہاں" (یعنی ارتداد عرب) پھر میں نے عرض کیا "اس شر کے بعد خیر ہو گی؟" فرمایا "ہاں مگر اس میں کمزوری رہے گی۔" میں نے عرض کیا "کمزوری کیا ہو گی؟" فرمایا "ایسے لوگ ہوں گے جو میری راہ سے ہٹ کر عمل کریں گے، ان کی کوئی بات تمہیں پسند ہو گی اور کوئی ناپسند" میں نے عرض کیا "اس خیر کے بعد تو شر نہیں آئیگا؟ فرمایا "ہاں جہنم کے دروازے پر بلانیوالے کھڑے ہوں گے اور جو بھی ان کی طرف جھکے گا وہ اسے جہنم میں دھکیل دیں گے میں نے عرض کیا "ان کی کچھ نشانیاں تو بتلائیے" فرمایا۔ ہمیں میں سے ہوں گے اور ہماری ہی زبانیں بولیں گے۔ (یعنی کہیں گے اپنے آپ کو مسلمان مگر عقائد و اعمال میں کتاب و سنت اور اجماع صحابہ کے خلاف ہوں گے) میں نے عرض کیا "اگر ایسا وقت آجائے تو میرے لئے آپ کا کیا حکم ہے؟ فرمایا "**مسلمانوں کی جماعت اور ان کے امام سے وابستہ رہنا**"۔

علماء اور خلفاء کے باہمی تعاون اور احترام ہی کی یہ برکت تھی کہ دین اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ دنیا میں پھیلا، فتوحات اسلامیہ کا دائرہ بڑھا اور اقوام عالم میں ثقافت اسلامیہ کی عظمت و مقبولیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ [illegible]

ہوئیں اور بعض بعض کے مابین تو تلخی بھی پیدا ہوئی۔ کشت و خون بھی ہوا، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ پوری تاریخ پر خط تنسیخ پھیر کر کوئی یہ کہہ دے کہ "چند قدم راہِ راست چل کر جو یہ امت ہٹی تو ہٹتی ہی چلی گئی" یا بقول ان مودودی صاحب کے سنہ ۴۰ھ کے بعد امت کی قیادت جاہلیت کے ہاتھ میں چلی گئی گویا تمام صحابہ جو سنہ ۴۰ھ کے بعد زندہ رہے اور تمام ائمہ و علماء و فقہاء امت سب جاہلیت کے پیرو چلے آتے ہیں نعوذ باللہ من شر الوسواس الخناس۔

وفات امام امام اعظمؒ کی وفات کے سلسلے میں ایک مکروہ بات کو بڑی شہرت دی گئی ہے یعنی امیر المومنین المنصورؒ نے امام اعظمؒ کو قاضی بنانا چاہا وہ تیار نہیں ہوئے تو قید کر دیا گیا، تازیانے لگائے گئے اور بالآخر زہر دیکر شہید کر دیا گیا۔ وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ امام صاحب کے نزدیک نظام خلافت باطل تھا۔ اور آپ چاہتے تھے کہ خلافت علویہ میں آئے یعنی آپ کے نزدیک دین اور ملت اور دعوت تو کوئی چیز نہ تھی ایک مخصوص خاندان کی حاکمیت پر عقائد و اعمال کی صحت کا مدار تھا۔ صفحات گزشتہ میں ان خرافات کی تنقیح کی جا چکی ہے۔ یہاں ہم صرف آپ کی وفات کے بارے میں صحیح واقعہ لکھنا چاہتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ قید و تازیانہ اور زہر دینے یا یا ہمی بے حرمتی کی تمام داستان از سر تا پا باطل ہے۔ اور قریب العہد مصنفوں نے ایسی کوئی بات نہیں لکھی۔

قریبی زمانہ طبری کا ہے (م سنہ ۳۱۰ھ) انھوں نے امام صاحب کے بارے میں تین روایتیں لکھی ہیں اور ان میں اس کا اشارہ تک نہیں کہ امام صاحب کو قید کیا گیا، کوڑے برسائے گئے یا زہر دیا گیا۔ پہلی روایت تو وہ

ہے جو تعمیر بغداد کے سلسلے میں ہم نقل کر چکے کہ امیر المومنین المنصورؒ نے انھیں صاحب فضل و عدالت و ثقہ و امانت سمجھ کر بغداد طلب کیا۔ اور آپ نے خدمت مفوضہ انجام دی۔ دوسری روایت یوں ہے۔

ان المنصور اراد ابا حنیفۃ النعمان بن ثابت علی القضاء فامتنع عن ذلک فحلف المنصور ان یتولی له و حلف ابو حنیفۃ الا یفعل فولاه القیام ببناء المدینۃ وضرب اللبن و عده و اخذ الرجال بالعمل قال و انما فعل المنصور ذلک لیخرج عن یمینه۔ قال وکان ابو حنیفۃ المتولی لذلک حتی فرغ من استتمام بناء حائط مما یلی الخندق وکان استتمامه فی سنۃ ۱۴۹ھ

المنصورؒ نے ابو حنیفہ نعمان بن ثابت کو قاضی بنانا چاہا مگر انھوں نے اس سے انکار کر دیا اس پر المنصورؒ نے قسم کھائی کہ انھیں انکی خدمت انجام دینی ہوگی اور ابو حنیفہؒ نے قسم کھائی کہ وہ ایسا نہیں کریں گے اس لئے انھیں شہر کی تعمیر کیلئے اینٹیں بنوانے اور گننے اور لوگوں کو اس کام پر لگانے کی خدمت سپرد ہوئی۔ راوی کہتا ہے کہ المنصور نے یہ محض اپنی قسم پوری کرنے کیلئے کیا۔ پھر کہتا ہے کہ ابو حنیفہ اس کام کے متولی رہے یہاں تک کہ شہر کی وہ فصیل مکمل ہوگئی جو خندق سے ملحق تھی۔ اور یہ تکمیل سنہ ۱۴۹ھ میں ہوئی۔

تیسری روایت ہے۔

ان المنصور عرض علی ابی حنیفۃ القضاء والمظالم

المنصور نے ابو حنیفہ کو قضاء اور مظالم کی دادرسی کی خدمت پیش

فامتنع فحلف ان لا يقطع عنه حتى يعمل - فاخبر بذلك ابو حنيفة فدعا بقصبة فعد اللبن على رجل قد لبنه و كان ابو حنيفة اول من عد اللبن بالقصب فاخرج ابا جعفر عن يمينه واعتل و مات ببغداد -

کی مگر انھوں نے انکار کر دیا اس پر المنصور نے قسم کھائی کہ انھیں اس وقت تک نہیں چھوڑیں گے جبتک وہ کوئی خدمت انجام نہ دیں۔ ابو حنیفہ کو جب اسکی خبر دی گئی تو انھوں نے ایک چھڑی منگوائی اور جس شخص نے اینٹیں بنائی تھیں اسکی اینٹیں گنیں ابو حنیفہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے چھڑی سے اینٹیں گنیں۔ اس طرح انھوں نے ابو جعفر کی قسم پوری کر دی پھر وہ بیمار پڑ گئے اور بغداد میں وفات پائی ۔

صرف یہی تین روایتیں ہیں جو طبری نے اس سلسلے میں بیان کی ہیں اس کا اشارہ بھی نہیں کہ ان دونوں بزرگوں کے مابین کوئی تلخی تھی اور امام پر وہ تشدد کیا گیا جو بعد کے لوگوں نے بیان کیا ہے، واقعی اور روایات میں اس قسم کی باتیں کبھی نہ کبھی ہوتی ہی رہتی ہیں۔ آخری روایت میں امام صاحب کی وفات بیماری کے سبب بیان کی گئی ہے نہ کہ کوڑوں کی ضرب یا زہر خورانی کے ذریعہ۔ یعنی ان کی وفات طبعی تھی۔

روایتیں اگرچہ تین ہیں لیکن ترجیح روایت ۲ ہی ہے کہ تین حضرات کو ان کے علم و تقویٰ اور دیانت کے علاوہ فن تعمیر میں مہارت کی بنا پر منتخب کیا گیا تھا ان میں امام صاحب بھی تھے۔ اس خدمت کو تیسری روایت میں خشت شماری سے تعبیر کر دیا گیا۔ بر بنائے دیانت و تقویٰ نگرانی تعمیر کی (۲) خدمت کے علاوہ جو دوسری دو علمی خدمتیں تھیں آپنے بخوبی انجام

دیا وہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ حضرت حجاج بن ارطاۃؒ بھی فقیہ اور عالم تھے۔ بغداد کی جامع مسجد انہی کی نگرانی میں تیار ہوئی تھی لیکن ان کے یا کسی دوسرے بزرگ کے متعلق خطیبؒ نے ایسی کوئی بات نہیں لکھی صرف امام صاحب کو ان فضولیات کے لئے خاص کیا ہے۔ یہ محض اس تعصب کے سبب ہے جو انھیں امام صاحب سے تھا۔ اور مقصد ان کی توہین ہے اور یہ دکھانا کہ امیر المؤمنین المنصورؒ کے نزدیک ان کی کوئی حرمت نہ تھی۔ حتی کہ انھوں نے یہ لغو روایت بھی لکھدی (السہم المصیب ص ۱۲۳-۱۲۴ طبع دیوبند)

..... رازی بیان کرتا ہے کہ اس نے ابو مسہر کو یہ کہتے سنا کہ

فلاں کے باپ پر ائمہ مساجد اس منبر سے لعنت کیا کرتے تھے

اور اشارہ دمشق کے منبر کی طرف کیا۔ فرہیانی کہتے ہیں کہ فلاں

کے باپ سے مراد ابو حنیفہ تھے۔"

یہ روایت نقل کرکے سلطان المعظمؒ فرماتے ہیں۔

لم یکن غرض الخطیب ان یذکر هذا عن ابی حنیفة انما جعل اباحنیفة ذریعة واراد ان یذکر الناس بما نقل مما کان علی منبر دمشق ولم اتتبع رجال هذا السند بالکشف لعلم الناس بمن اراد بالحکایة وشهرة الخبر اغنت عن ذکره۔ لانه اخذ الا یلیق	خطیبؒ کی غرض یہاں یہ نہیں ہے کہ ابو حنیفہؒ کا ذکر کریں۔ انھوں نے تو ابو حنیفہ کو ذریعہ بنایا ہے کہ منبر دمشق پر جو کچھ ہوتا تھا اسے لوگ ذہن میں رکھیں میں نے اس سند کے راویوں کی تحقیق نہیں کی کہ اس حکایت میں جس شخص کا ذکر مقصود ہے اسے لوگوں کی معلومات کے لئے دریافت کروں کہ اس خبر کو مشہور کرکے کس کے ذکر کو ناپاک

على المنبر الا باذن الامام وابو حنيفة كان فى دولة بنى العباس فى زمن المنصور فلو لعن على منبر دمشق لكان لعن على منابر العراق اذ هى دار الخلافة۔ ولم ينقل هذا الخطيب ولا غيره

کیا گیا ہے، کیونکہ کوئی شخص خلیفۂ وقت کی اجازت کے بغیر منبر پر ایسی لغو بات نہیں کر سکتا، ابو حنیفہ منصور کے عہد میں خلافت عباسیہ کی شہری تھے اگر انہیں دمشق کے منبر سے لعنت ہوتی تھی تو عراق کے منبروں پر بھی ہوتی ہو گی، کیونکہ وہ دار الخلافہ تھا لیکن ایسی بات نہ خطیب نے کہی ہے اور نہ کسی دوسرے شخص نے۔

خطیب کو امیر المؤمنین المنصورؒ سے تعصب نہ تھا، لیکن امام صاحب سے تھا اور اپنے تعصب میں وہ اتنے بہہ گئے کہ لوگوں کی نگاہوں سے انھیں گرانے کے لئے یہ ثابت کرنا چاہا کہ وہ بے حیثیت شخص تھے اور امام المسلمین کے ہاں ان کی کوئی حرمت نہ تھی۔ ابن خلکانؒ نے وفیات الاعیان میں خطیب کی اس حرکت پر نکتہ چینی کی ہے کہ ان جیسے صاحب علم کو اس قسم ذہنیت سے بلند ہونا چاہئے تھا۔ لیکن یہاں دیکھنا چاہئے طبری کو، جنھیں اپنے مخصوص شیعی عقائد کی بنا پر نہ امیر المؤمنین سے کوئی دلی تعلق تھا اور نہ امام صاحب سے۔ اور وہ خطیب سے بہت پہلے گزرے ہیں انھوں نے اس قسم کی کوئی بات کیوں نہیں بیان کی۔ حالانکہ ایسی کوئی روایت انھیں پہنچی ہوتی تو اسے بخوشی نقل کرتے۔

طبری کے بعد قریب ترین عہد کا مؤرخ مسعودی ہے۔ اسے بھی اپنے مخصوص عقائد کے تحت ان دونوں بزرگواروں سے کوئی دلی تعلق نہیں ہو سکتا تھا، اس نے تو کبار صحابہ پر طعن کی بہت سی باتیں لکھی ہیں۔

لیکن امام صاحب کی وفات کے سلسلہ میں صرف اتنا لکھا ہے (مروج الذہب)

وفی سنۃ خمسین ومائۃ مات ابو حنیفۃ النعمان بن ثابت مولی تیم اللات بن بکر بن وائل فی ایام المنصور ببغداد وتوفی وھو ساجد فی صلوٰتہ وھو ابن سبعین سنۃ۔

سنہ ۱۵۰ھ میں ابو حنیفہ نعمان ثابت جو تیم اللات بن ابی بکر بن وائل کے موالی میں تھے، انھوں بعہد امیر المومنین المنصور بغداد وفات پائی۔ نماز پڑھتے وقت کی حالت میں ان کا انتقال ہوا، وہ اس وقت ستر برس کے تھے

تدفین امام صاحب کو امیر المومنین المنصور نے سرکاری اعزاز کے ساتھ اپنے خاندانی قبرستان میں دفن کروایا۔ ابن قتیبہ (م ۲۸۶ھ) جو طبری سے بھی پہلے گزرے ہیں انھوں نے المعارف میں امام صاحب کا تذکرہ اس عنوان سے کیا ہے "ابو حنیفۃ صاحب الرای رضی اللہ عنہ" اور فرماتے ہیں۔

ومات ببغداد فی رجب سنۃ خمسین ومائۃ وھو یومئذٍ ابن سبعین سنۃ ودفن فی مقابر الخیزران۔

آپ کی وفات بغداد میں ہوئی رجب سنہ ۱۵۰ھ میں۔ اس وقت آپ ستر برس کے تھے۔ اور مقابر خیزران میں دفن کئے گئے۔

امیر المومنین نے جن حضرات سے خدمات لیں اور جن کی ان کے دل میں قدر تھی ان کی وفات پر اعزازاً اپنے خاندانی قبرستان میں جگہ دی۔ سیدہ خیزران امیر المومنین ہارون الرشید کی والدہ ماجدہ تھیں۔ بعد میں یہ قبرستان انہی کے نام سے مشہور ہو گیا۔ چنانچہ خطیب بغدادی لکھتے ہیں

ج ۱، ص ۱۲۵)

اول من دفن فیها الیاقوتہ بنت المھدی ثم الخیزران ودفن فیھا محمد بن اسحٰق صاحب المغازی، والحسن بن زید، ولنعمان بن ثابت وقیل ھشام بن عروۃ۔

سب سے پہلے وہاں امیرالمومنین المہدی کی صاحبزادی یاقوتہ دفن ہوئیں پھر سیدہ خیزران۔ اور وہیں محمد بن اسحاق دفن ہوئے نیز حسن بن زید اور نعمان بن ثابت اور کہتے ہیں ہشام بن عروہ بھی۔

یہ حضرت حسن بن زید بن حسن بن علی بن ابی طالب، امیرالمومنین کے ہاں نہایت مقرب تھے اور ان کی طرف سے مدینہ طیبہ کے والی بھی رہے ہیں پھر آپ نے انھیں اپنا ندیم بنا لیا اور وفات پر اپنے قبرستان میں انھیں دفن کیا۔

ہشام بن عروۃ بن الزبیر۔ سیدنا زبیرؓ کے پوتے تھے اور انھیں علم الانساب اور تاریخ کا علم اپنے والد ماجد حضرت عروہؒ سے ملا جو حضرت ام المومنین عائشہؓ کے سگے بھانجے اور شاگرد رشید تھے۔

اسی طرح ابوعبداللہ الحاکم نے "معرفۃ علوم الحدیث" میں لکھا ہے (ص ۱۹۴)

قال ابو عبد اللہ فاما مدینۃ السلام فانی لا اعلم صحابیاً توفی بھا۔ الا ان جماعۃ من التابعین واتباع التابعین نزلوھا وماتوا بھا۔ منھم ھشام بن عروۃ بن الزبیر ومحمد بن اسحاق بن یسار، واسماعیل بن سالم

ابوعبداللہ کہتے ہیں "مدینۃ السلام (بغداد) کے متعلق مجھے علم نہیں کہ وہاں کسی صحابی کی وفات ہوئی ہو مگر یہ ہے کہ تابعین اور اتباع التابعین میں سے ایک جماعت وہاں آئی اور وہ حضرات یہیں دفن ہوئے۔ ان میں ہشام بن عروۃ بن الزبیرؒ ہیں اور محمد بن اسحاق بن یسار

الاسدی ابوحنیفۃ الفقیہ و شیبان بن عبد الرحمٰن النحوی وابراھیم بن سعد الزھری جماعۃ ھؤلاء فی مقبرۃ الخیزران۔

اسماعیل بن سالم الاسدی، ابوحنیفہ الفقیہ، شیبان بن عبد الرحمٰن نحوی اور ابراہیم بن سعد زہری ہیں۔ یہ سب حضرات مقبرہ خیزران میں دفن ہیں۔

اس تدفین کے عمل ہی سے ثابت ہوتا ہے کہ امیر المؤمنین المنصور کے ہاں امام اعظمؒ کا کتنا احترام تھا مگر ہوا پرست لوگوں نے امت کے ان عظیم المرتبت اماموں کے بارے میں کیسی لغو اور فضول باتوں کو شہرت دی ہے علماء امت دین کی بنیاد پر خلفاء اسلام کے ساتھ اپنے روابط مضبوط رکھتے تھے۔ اور خلفاء کے ہاں بھی علماء امت کا بغایت احترام تھا۔ اسی وجہ سے علوم و فنون کی ترویج ہوئی اور ثقافت اسلامیہ کو فروغ ہوا۔ کتنے بزرگوں کے احوال ہیں جنھوں نے اگر خلفاء اسلام کے ہاں وفات پائی تو انکی تدفین سرکاری اعزاز سے ہوئی اور امیر المؤمنین نے خود ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔ ابو عبداللہ الحاکم لکھتے ہیں (معرفۃ علوم الحدیث ص ۱۹۴) کہ عبد العزیز بن عبداللہ بن ابی سلمہ الماجشونؒ جو اکابر علماء میں ہیں وہ بغداد تشریف لائے اور یہیں وفات پائی تو امیر المؤمنین المہدی عباسیؒ ان کے دفن میں شریک ہوئے خود نماز پڑھائی اور مقابر قریش میں انھیں دفن کیا، اسی طرح عبدالملک بن محمد بن ابی بکر بن حزمؒ کو امیر المؤمنین الرشیدؒ نے قاضی بنایا۔ ان کی وفات پر خود نماز پڑھائی اور مقابر قریش میں انھیں دفن کیا اور ایسے ہی سیکڑوں واقعات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہوا پرست لوگوں نے خلافت قائمہ اور علماء و فضلاء امت کے مابین اختلافات کے جو فرضی واقعات بیان کر کے نظام خلافت کو باطل قرار دینا چاہا ہے وہ اپنے بیان میں کاذب ہیں اور افترا پرداز

امام اعظم ابوحنیفہؒ اور شیعیت

امیرالمؤمنین سیدنا عثمان ذوالنورین صلوات اللہ وسلامہ علیہ، روئے زمین کے عظیم ترین حکمراں تھے جن کے ایک اشارے پر ملک کے ملک فتح کر ڈالے جاتے تھے۔ جن کے احکام سے سرتابی کو خدا اور رسول کی نافرمانی سمجھا جاتا تھا اور جن کی شخصیت صحابہ کرام کی نگاہ میں محبوب ترین تھی۔ شاعر اپنی محبوبہ سے کہتا ہے۔ اَحِبُّكِ وَالرَّحمٰن ۔ حُبَّ قریشٍ عثمان (بخدا میں تجھ سے ایسی محبت کرتا ہوں جیسی محبت قریش کو عثمان سے ہے) اس سرآمد محبوبان بارگاہ احدیت و رسالت کو چند بے ننگ و نام لوگوں نے خاص دارالخلافہ میں شہید کر ڈالا اور سب دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ یہ سانحہ اس امام برحق کے محض اس اصرار کے سبب ہوا کہ کسی کلمہ گو پر تلوار نہ اٹھائی جائے۔ ورنہ ایسا کرنے والے کو میں اپنی بیعت سے خارج کر دوں گا۔ اس منظر کا نقشہ حضرت کعب بن مالک انصاری رضی نے یوں کھینچا ہے

فَكَفَّ يَدَيْهِ وَاَغْلَقَ بَابَهُ ۔ وَاَيْقَنَ اَنَّ اللهَ لَيْسَ بِغَافِلِ

انھوں نے اپنے ہاتھ روک لئے اور پھر گھر کا دروازہ بند کر لیا۔ اور یقین رکھا کہ اللہ تعالیٰ غافل نہیں (وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے)

وَقَالَ لِاَهْلِ الدَّارِ لَا تَقْتُلُوْهُمْ ۔ عَفَا اللهُ عَنْ كُلِّ امْرِئٍ لَمْ يُقَاتِلِ

جو لوگ گھر کی حفاظت کیلئے جمع تھے ان سے فرما دیا انھیں قتل مت کرنا خدا ہر اس شخص کو بخشدے جو تلوار نہ اٹھائے۔

فَكَيْفَ رَاَيْتَ اللهَ صَبَّ عَلَيْهِمُ الْـ ـعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ بَعْدَ التَّوَاصُلِ

تو دیکھ لو اللہ نے ان لوگوں یک جہتی کے بعد ان کے مابین کس طرح عداوت و بغض کو مسلط کر دیا۔

وَکَیْفَ رَأَیْتَ الْخَیْرَ اَدْبَرَ بَعْدَہٗ عَنِ النَّاسِ اِدْبَارَ الرِّیَاحِ الْجَوَافِلِ

اور دیکھ لو ان کی شہادت کے بعد بھلائی نے لوگوں کی طرف سے کیسے منہ موڑ لیا جیسے تیز و تند ہوا اسے اڑا لے گئی ہو۔

خواجہ حسن بصریؒ اس وقت چھ سات برس کے تھے مگر یہ منظر جو بچپن میں خود بھی دیکھا اور بزرگوں سے سنا انھیں خوب یاد تھا۔ فرماتے ہیں (طبقات المدنیین):

خرج علینا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ یوما یخطبنا فقطعوا علیہ کلامہ فتراموا بالبطحاء حتی جعلت ما ابصر ادیم السماء قال وسمعنا صوتا من احدی حجر ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقیل ھذا صوت ام المؤمنین قال سمعتھا وھی تقول الا ان نبیکم قد بری ممن فرق دینہ واحتزب وقالت اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ وَ کَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْھُمْ فِیْ شَیْءٍ

امیرالمؤمنین عثمانؓ ایک دن خطبے کے لیے تشریف لائے تو لوگوں نے آپ کی بات کاٹ دی اور اتنی کنکر یاں پھینکیں کہ فضا پر چھا گئیں اور مجھے آسمان نظر نہیں آتا تھا۔ ا... میں ازواج مطہرات کے ایک حجرے سے آواز بلند ہوئی اور کہا گیا کہ ام المؤمنین عائشہ صلوات اللہ علیہا کی آواز ہے۔ آپ فرمارہی تھیں یاد رکھو تمہارے نبی اس شخص سے بری ہیں جس نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے گروہ بندی کی پھر آیت پڑھی جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ گروہ

ن گئے والے نبی اتمہارا ان سے کسی بارے میں کوئی تعلق نہیں "
یہ تھی اس مظہر جمال خلیل اللہ اور پر تو کمال ذبیح اللہ کی شہادت عظمیٰ
جس کی نظیر از آدم تا ایں دم کہیں نہیں ملتی کہ پوری طاقت رکھنے اور اپنے فدائیوں
کی جمعیت کے باوجود آدمی تلوار نہ اٹھانے دے اور جان جان آفریں کے سپرد کر دے

ہ کاشانۂ خلافت کی حفاظت کرنے والوں میں عبداللہ بن عمرؓ عبداللہ بن عباسؓ محمد بن طلحہؓ
عبداللہ بن الزبیرؓ۔ مروان بن الحکمؓ۔ حسن بن علیؓ جیسے حضرات تھے۔ چھت پر پہرہ دینے
والوں میں ابو ہریرہؓ جیسے بزرگوار تھے، ام المؤمنین ام حبیبہ صلوات اللہ علیہا جب
باغیوں کو سمجھانے اور تسکین دینے آپ پہنچانے تشریف لائیں تو اشتر نخعی نے آپ کے خچر
کے منہ پر گھونسا مار کر اس کا رخ پھیر دیا، امیر المؤمنین کو جب یہ معلوم ہوا تو آپ نے
ابن عباسؓ کو حکم دیا کہ ازواج مطہرات کو لے کر فوراً مکہ چلے جائیں انھوں نے
عرض کیا کہ میرے نزدیک حج سے زیادہ ضروری ان باغیوں کے خلاف جہاد
معلوم ہوتا ہے۔ مگر آپ نے سرکاری طور پر انھیں امیر حج بنا کر روانہ کر دیا
اور ساتھ ہی ایک مکتوب دیا کہ حاجیوں کو سنا دیں تاکہ مدینہ کی صورت حال
انھیں معلوم ہو جائے۔ محافظوں کی طرف سے بار بار عرض کیا جاتا تھا کہ قتال
کی اجازت مل جائے مگر اس پر کسی طرح تیار نہیں ہوئے حتیٰ کہ آخر میں سب نے اپنا
گھر خالی کرا لیا۔ ابن الزبیرؓ سب کے بعد نکلے تھے۔ کیونکہ حضرت ا الزبیرؓ کو
امیر المؤمنین نے اپنا وصی مقرر کیا تھا۔ مکان تو خالی ہو گیا مگر محافظ دروازے
پر برابر موجود رہے۔ امیر المؤمنین شہادت کے لئے پوری طرح تیار ہو کر تلاوت
کلام پاک میں مشغول تھے کہ برابر کے ایک خالی گھر میں سے چڑھ کر چند
باغی اندر آ گئے اور آپ کو شہید کر دیا۔ آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمین
(باقی صفحہ ۱۴۴ پر)

پھر انہی قاتلوں کے ہاتھوں حضرت علیؓ کی خلافت کا اعلان کر دیا گیا اس سبب سے اس وقت مسلمانوں کے دو سیاسی گروہ پیدا ہو گئے اور حالات ایسے بگڑ گئے کہ کشت و خون تک نوبت پہونچی۔

جس گروہ نے حضرت علیؓ کی خلافت تسلیم کر لی تھی اور ان میں بعض صحابی بھی تھے، یہ لوگ شیعہ علی کہلائے۔ ان کا موقف تھا کہ اولین مسئلہ حضرت علیؓ کی بیعت کی تکمیل کا ہے۔ اس کے بعد دوسرے مسائل ہیں

ان کے مقابلے میں وہ صحابہ اور دیگر حضرات تھے جن کے نزدیک اولین مسئلہ خون عثمانؓ کے قصاص کا تھا۔ اس کے بعد حضرت علیؓ کی خلافت تسلیم کرنے یا نہ کرنے کا، کیونکہ وہ اس بیعت کے انعقاد کا طریقہ درست نہیں سمجھتے تھے۔ اس لئے کہ یہ نئی خلافت شہید مظلوم کے قاتلوں نے برپا کی تھی اور وہی اس کے کرتا دھرتا بنے ہوئے تھے۔ یہ حضرات شیعہ عثمان کہلائے ان میں بھی اجلہ صحابہ تھے۔ یعنی عشرہ مبشرہ میں حضرت طلحہؓ حضرت زبیرؓ اور پھر سب سے بڑھ کر ام المومنین عائشہ صدیقہ صلوات اللہ علیہا نیز حضرت معاویہؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ وغیرہم

اسی اختلاف کے سبب جمل و صفین کے معرکے ہوئے۔ لیکن شیعہ علی اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکے اور حضرت علی کی خلافت کی آئینی حیثیت آخر وقت تک معرض بحث رہی تا آنکہ آپ ہی کے ایک باغی فرد نے آپ کو

(بقیہ صفحہ ۱۴۳) آپ کی زوجہ محترمہ سیدہ نائلہ رضی اللہ عنہا نے جب دیکھا تو آپ کے اوپر جھک گئیں لیکن آپ کی انگلیاں کٹ گئیں اور آپ کو دھکیل کر قاتل اپنا کام کر گئے۔ محمد بن ابی بکر، عمرو بن الحمق اور کنانہ بن بشر اس ٹولی میں تھے

شہید کر دیا۔ یہ اختلاف خالص سیاسی تھا۔ اور اجتہاد پر مبنی، اسے پرامن طریقے پر طے کیا جا سکتا تھا اور اس کے مواقع بھی بار بار پیدا ہوئے مگر امت کے اندرونی دشمنوں کے سبب ایسا نہ ہو سکا اور مفت میں خونریزی ہوئی، اس نزاع کے سیاسی اور اجتہادی ہونے کی اس سے بڑی دلیل کیا ہو گی کہ اگر ایک طرف حضرت علیؓ ہیں تو دوسری طرف ان کے سگے بڑے بھائی حضرت عقیلؓ۔ اگر حضرت علیؓ کی طرف مہاجر بن خالدؓ بن ولید ہیں تو حضرت معاویہؓ کی طرف ان کے بھائی عبدالرحمان بن خالدؓ بن ولید۔ اگر حضرت علیؓ کے ساتھ محمد بن ابی بکرؓ ہیں تو حضرت معاویہؓ کے ساتھ ان کے بڑے بھائی حضرت عبدالرحمان بن ابی بکرؓ۔ اگر حضرت عبداللہ بن عمرؓ غیر جانبدار ہیں تو ان کے بھائی حضرت عبیداللہ بن عمرؓ حضرت معاویہؓ کے ساتھ ہیں معلوم ہوا کہ شیعہ علیؓ اور شیعہ عثمانؓ میں نہ کوئی دینی اختلاف تھا اور نہ خاندانی چپقلش، بلکہ یہ دو سیاسی گروہ تھے جو فلاح امت کے لئے اپنے اپنے موقف کو صحیح سمجھتے تھے۔ اور انھیں اپنی حقانیت اور عزائم کے تعمیری ہونے کا ایسا یقین تھا کہ ایک دوسرے کے خلاف تلوار اٹھانے سے بھی وہ باز نہ رہ سکے۔

لیکن ساتھ ہی ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن العاص اگرچہ حضرت معاویہؓ کے ساتھ ہیں لیکن جنگ میں حصہ نہیں لیتے اور اسے مفادِ ملت کے خلاف جانتے ہیں اسی طرح حضرت حسنؓ ہیں تو اپنے والد ماجد کے ساتھ مگر قتال سے انھیں بھی گریز ہے اور چاہتے ہیں کہ امت کا کلمہ متحد رہے۔ اور خوں ریزی نہ ہو[۱] حضرت معاویہؓ کو حضرت

---

[۱] یہ مواقف تو صحابہ کرام کے بیان ہوئے ان کے علاوہ بھی تابعین (باقی صفحہ ۱۴۶ پر)

علیؓ کی بیعت سے انکار نہیں بشرطیکہ وہ قاتلان عثمانؓ سے بے تعلق ہو جائیں
حضرت علیؓ کو قصاص عثمانؓ کے وجوب سے انکار نہیں مگر چاہتے ہیں
کہ اول ان کی بیعت کی تکمیل ہو۔
ساری پیچیدگی ان قاتلوں نے پیدا کر دی ہے جو حضرت علیؓ کی خلافت
پر حاوی ہیں اور کوئی مسئلہ خوش اسلوبی سے طے نہیں ہونے دیتے کیونکہ

(بقیہ صفحہ ۱۴۵) کی بڑی جماعت تھی، جنھوں نے حضرت علیؓ سے بیعت کر لی تھی
اور آئینی حیثیت سے انھیں امت کا امام جانتے تھے۔ ان کی حالت بھی یہ تھی
کہ حضرت معاویہؓ کے خلاف انھیں لڑنا گوارا نہ تھا، اول تو ان کی شخصی عظمت
اور خدمات جلیلہ تھیں۔ پھر جو مطالبہ لے کر وہ کھڑے ہوئے تھے اسکی حقانیت
دلوں میں ایسی گھر کر گئی تھی کہ ان کے خلاف نبرد آزما ہونے پر ان کے قلوب
مائل نہ ہو سکے۔ حالانکہ یہ لوگ ہمدانی تھے جنھیں حضرت علیؓ سے خاص عقیدت
تھی۔ اپنی رعایا کی اس نفسیاتی کیفیت کا ادراک خود آپ کو بھی تھا، اسی
لئے جو لوگ صفین کی جنگ میں شرکت پر تیار نہ تھے انھیں آپنے دوسرے
علاقوں میں جہاد کے لئے بھیج دیا تاکہ آپ کی فوج کی صفوں میں انتشار نہ پھیلے
چنانچہ فتوح البلدان میں ہے (ج ۱، ص ۴۵۸ ترجمہ)

"مرۃ ہمدانی کہتے ہیں کہ علی بن ابی طالبؓ نے ہم سے فرمایا "تم میں سے جو شخص ہمارے
ساتھ ہو کر معاویہؓ سے قتال پسند نہ کرے وہ اپنی عطا لے لے اور دیلمیوں کی
طرف جا کر ان سے جنگ کرے، راوی کہتے ہیں میں انہی میں تھا جنھوں نے
دوسری صورت پسند کی۔ ہم نے عطائیں لیں اور دیلم کی جانب روانہ ہوئے
ہماری تعداد پانچ ہزار تھی"

انھیں اپنی خیر نظر نہیں آتی۔ ان کا نصب العین ہے کہ امت میں فساد ہو۔ اور انتشار پھیلے، ان کے عزائم کے بارور ہونے کی سبیل ہی یہ تھی کہ امت کا کلمہ متفرق رہے اور ائتلاف کی صورت پیدا نہ ہونے پائے۔ اسی لئے اس سیاسی خلفشار کو وہ مذہبی اور خاندانی رنگ دے کر فرقہ بازی کے درپے ہیں۔ تا کہ امت کا مستقبل تباہ ہو۔ حضرت علیؓ کی خواہش بھی تھی کہ اس چپقلش کو صرف سیاسی سمجھا جائے۔ اور فرقہ بازی پیدا نہ ہونے پائے۔ چنانچہ یہی مسئلہ صاف کرنے کے لئے آپ نے صفین کے بعد ثالثی نامہ ہونے پر اپنے اور اہل شام کے بارے میں ایک گشتی مراسلہ جاری کیا اور وضاحت کر دی کہ ان جنگوں کو سیاسی کے علاوہ کوئی دوسرا رنگ نہ دیا جائے۔ یہ مراسلہ کتب تاریخ کے علاوہ نہج البلاغۃ کے مصنف نے بھی نقل کیا ہے (نہج البلاغۃ جز ۲، ص ۱۵۹)

"یہ گشتی مراسلہ ہے۔ جو (علی) علیہ السلام نے تمام شہروں میں بھیجا۔ اس میں آپ نے وہ صورت حال بیان کی ہے۔ جو آپ کے اور اہلِ شام کے مابین پیدا ہو گئی تھی، اس میں فرماتے ہیں ...."

"ہمارے معاملے کی ابتدا یہ ہوئی کہ ہم میں اور اہل شام میں مقابلہ ہوا۔ ظاہر ہے کہ ہمارا اور ان کا خدا ایک، ہمارا اور ان کا نبی ایک، ہماری اور ان کی دعوت اسلام ایک، اللہ پر ایمان رکھنے اور اس کے رسول کی تصدیق کرنے میں نہ ہم ان سے زیادہ ہیں اور نہ وہ ہم سے۔ پس معاملہ واحد ہے۔ سوائے اس کے کہ ہم میں اور ان میں خون عثمانؓ کی بابت

اختلاف ہوا اور ہم اس سے بری ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ”

ان شیعۂ علیؓ اور شیعہ عثمانؓ کے علاوہ امت کا سواد اعظم تھا اور صحابۂ کرام کا جم غفیر ان کا موقف تھا کہ حضرت علیؓ کی بیعت کی تکمیل ہو جانی چاہیئے لیکن خون عثمانؓ کا قصاص بھی سب سے مقدم ہے ۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ ان دونوں مسئلوں کو جنگ کے بغیر باہمی گفت و شنید سے طے کیا جائے ان حضرات کی کوشش تھی کہ ان کی طرح تمام امت کو جنگوں میں فریق بننے سے گریز کرنا چاہیئے ۔ تاکہ پُر امن ماحول میں تصفیہ کر لیا جائے، اس سواد اعظم کے نزدیک یہی وہ فتنہ تھا ۔ جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈرایا ہے ۔ عشرہ مبشرہ میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت سعید بن زیدؓ اور حضرت اسامہ بن زید بن حارثہؓ، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ، حضرت عمران بن حصینؓ، حضرت ابو مسعودؓ، حضرت سلمہ بن الاکوعؓ وغیرہم تھے ۔ امت کے ان عظیم رہنماؤں نے جس طرح لوگوں کو ان جنگوں سے محترز رہنے کی تلقین کی، اس کی تفصیلات صحاح میں موجود ہیں ۔ جنھیں نقل کرنا موجب طوالت ہوگا ۔ مختصراً شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے تبصرے پر یہاں اکتفا کیا جاتا ہے (منہاج السنۃ ج ۲، ص ۲۱۹ - ۲۲۰)

وکان ترك القتال خیرٌ للطائفتین	دونوں فریقوں کے لیے بہتر تھا کہ نہ
مع ان علیا کان اولیٰ بالحق	لڑیں اگرچہ حق حضرت علیؓ کے زیادہ
ھذا قول احمد واکثر اھل	قریب تھا ۔ یہ قول ہے امام احمد کا
الحدیث واکثر ائمۃ الفقہاء	اکثر اہل حدیث کا اور فقہا کے اکثر ائمہ
وھو قول اکابر الصحابۃ و	کا اور یہی قول ہے اکابر صحابہ کا، اور
التابعین لھم باحسان وھو	خوبی کے ساتھ ان کا اتباع کرنیوالوں کا

قول عمران بن حصین رضی اللہ عنہ وکان ینہی عن بیع السلاح فی ذٰلک القتال و یقول ھو بیع السلاح فی الفتنۃ وھو قول اسامۃ بن زید ومحمد بن مسلمۃ و ابن عمرؓ وسعد بن ابی وقاص واکثر من بقی من السابقین الاولین من المہاجرین و الانصار رضی اللہ عنہم ولہذا کان مذہب اہل السنۃ الامساک عما شجر بین الصحابۃ فانہ قد ثبت فضائلہم ووجبت موالاتہم ومحبتہم

- اور یہی قول ہے عمران بن حصین رضی کا وہ ان جنگوں میں ہتھیاروں کی خرید و فروخت سے روکتے تھے اور فرماتے تھے کہ ہتھیاروں کا یہ کاروبار موجب فتنہ ہے، اور یہی قول ہے اسامہ بن زید کا، محمد بن مسلمہؓ کا ابن عمرؓ کا، سعد بن ابی وقاصؓ کا اور اکثر ان حضرات کا جو مہاجرین انصار کے اولین طبقہ کے اس وقت موجود تھے اسی لئے اہل السنۃ کا مذہب ہے کہ صحابہ کے اختلافات کے ذکر پر اپنی زبان روکیں، کیونکہ ان کے فضائل ثابت ہیں۔ اور ان سے تعلق خاطر رکھنا اور محبت رکھنا امت پر واجب ہے۔

صفین کا معرکہ جنگ بندی اور ثالثی پر منتج ہوا، اور یوں فریقین خوں ریزی سے کنارہ کش ہو گئے۔ ثالثوں نے فیصلہ وہی کیا جو غیر جانب دار اور جنگوں سے محترز رہنے والے حضرات چاہتے تھے یعنی پر امن ماحول میں صرف اصحاب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے شوریٰ سے حضرت عثمانؓ کے قصاص اور حضرت علیؓ کی خلافت کی آئینی حیثیت کا تصفیہ کیا جائے ابھی آخری اجتماع نہیں ہوا تھا کہ حضرت علیؓ کو ایک خارجی نے شہید کر دیا، اور

حضرت حسنؓ نے حضرت معاویہؓ سے صلح کر کے بیعت کر لی۔ (صحیح البخاری کتاب الصلح) پھر تمام صحابہ اور جمہور امت نے حضرت معاویہؓ کی خلافت پر اجماع کر لیا۔ اہلِ حق کے باہمی نزاع کا جب ایک فریق نہ رہا تو یہ قدرتی بات تھی کہ زمام امت فریق ثانی کے ہاتھ میں دیدی جائے۔ سب امت جیسے پہلے ایک تھی پھر ایک ہو گئی اور پرانی باتیں سب بھلا کر اسی اتفاق کی راہ پر رواں دواں ہو گئی جو شروع سے اس کا طریقہ کار تھا۔

لیکن ایک گروہ ابھی موجود تھا، جسے وحدت امت گوارا نہ تھی اور جس نے یہ سب فتنے اٹھائے تھے[1]۔ صحابہ کرام اور بنی ہاشم (آل بیت نبوی) کے طریقے اور عمل کے خلاف اس گروہ نے اپنا جتھا زیر زمین برقرار رکھا اور پھر عقائد و اعمال کے اعتبار سے ایک مستقل فرقہ بن گیا۔ اور اپنا نام شیعہ علی باقی رکھا اسی گروہ میں سے خوارج پیدا ہوئے تھے۔ اور اسی گروہ کی پھر ذیلی شاخیں بنیں جو سب ایک دوسرے کی تکذیب ہیں اور اپنے علاوہ دوسروں کو گم راہ غلط رو اور باطل پرست کہتے ہیں۔

---

[1] اس گروہ کی حرکتیں اہل صفار کو ناگوار تھیں، چنانچہ حضرت ابو ایوب انصاریؓ جنگ جمل تک حضرت علیؓ کے ساتھ تھے، پھر الگ ہو گئے اور صفین میں شریک نہیں ہوئے۔ (الاصابہ فی تمیز الصحابہ بذیل عنوان خالد بن زید) حضرت جریر بن عبداللہؓ جنگ جمل کے بعد تک ساتھ رہے لیکن پھر بد دل ہو کر مدینہ طیبہ چلے گئے۔ حضرت قیس بن سعد بن عبادہؓ صفین کے بعد تک ساتھ رہے اور مصر کے والی بنے لیکن سبائیہ کی ریشہ دوانیوں سے ناراض ہو کر الگ ہو گئے۔ اور مدینہ جا بیٹھے۔

جو شیعۂ علیؓ اور شیعہ عثمانؓ ایک ہو گئے تھے اور اپنے یہ امتیازی نام چھوڑ دئیے تھے، وہ اور جو گروہ عظیم غیر جانب دار تھا، انھوں نے باہم ربط مستحکم کر کے فرقوں کے مقابلوں میں اپنے آپ کو اہل سنت والجماعت کہا اور یہی امت کا سواد اعظم ہے۔ اسی نے حضرت معاویہؓ کی بیعت کے سال کا نام عام الجماعت رکھا۔ کیونکہ صحیح العقیدہ تمام امت ایک مرکز کے تحت منظم ہو گئی تھی۔ یہی سواد اعظم ہے۔ جو شروع سے آج تک سواد اعظم ہی چلا آ رہا ہے، وحدت امت کا داعی ہے اور دعوت محمدیہ کا دائم علمبردار مسلمانوں ہی میں نہیں بلکہ غیر مسلموں میں بھی امت کے اسی سواد اعظم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا نمائندہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہی مذہب حضرت علیؓ اور آپ کی صحیح النسب اولاد کا ہمیشہ رہا۔ انہیں سے بعض نے اپنی حکومت حاصل کرنے کی ناکام کوششیں تو کیں، لیکن عقائد و اعمال اسلامیہ پر سب متفق رہے۔ ان میں سے کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خلافت کا شرعی حق حضرت علیؓ اور ان کی اولاد کا ہے اور نہ کسی نے اپنے آپ کو معصوم کہا اور جنہ اللہ جانا ان کا جم غفیر جو عملی سیاست سے کنارہ کش رہا مثلاً حضرت علی بن الحسین (زین العابدین) ان کے فرزند محمد (الباقر) اور ان کے فرزند جعفر (الصادق) یا دوسرے حسنی اور حسینی حضرات سب کے سب اپنے اپنے وقت کے خلفاء کی بیعت پر مستقیم رہے۔ اس نظام خلافت کو صحیح اسلامی نظام سمجھا اور کوئی کام ایسا نہ کیا جو سیاسی اختلال کا سبب بنے۔

ان میں زیدیہ کے نام سے ایک فرقہ البتہ بنا، ان کے اخلاف نے اپنی حکومت بھی قائم کی، لیکن ان کے ہاں بھی یہ امر عقائد میں ہے کہ حضرت علیؓ

کی خلافت کی کوئی شرعی دلیل نہ تھی اور خلفاء کرام کی خلافت حق تھی البتہ یہ انھوں نے ضرور کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتے کے سبب ہم اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ خلافت پر فائز ہوں۔ اور یہ بات ایسی ہی ہے جیسے مختلف خاندانوں کے لوگ اپنی اپنی حکومت قائم کرنے کی تدبیریں کیا کرتے ہیں۔ حصول حکومت کو شرعی حیثیت سے عقیدہ بنانا یا کسی خاص شخص کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق خلیفہ مقرر ہونے کا تصور نہ زیدیہ کا تھا اور نہ کسی دوسرے علوی یا ہاشمی کا۔

ہاشمیوں کی سیاسی اور عمرانی واحد تحریک دعوت عباسیہ تھی لیکن اس دعوت کی بنا پوری طرح سیاسی اور عمرانی رکھی گئی۔ اس دعوت میں جو دنیا کی کامیاب ترین عوامی تحریکوں میں ہے اس تصور کا سہارا نہیں لیا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمان الٰہی کے تحت آل عباسؓ کو خلافت کا مستحق قرار دیا تھا۔ اور اس دینی بنیاد پر وہ کھڑے ہوئے ہیں، خاندانی شرف اور افضلیت کا بلاشبہ ذکر ہوا۔ مگر سبائیہ کے مقابلے میں جو حضرت علی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وارث اور جانشین کہتے تھے اور اسے فرمان الٰہی بتاتے تھے۔ ان کے مقابلے میں کہا گیا کہ چچا کی موجودگی میں چچا کا بیٹا کیسے وارث ہو سکتا ہے لیکن عوام کے سامنے جو اصول بتایا گیا وہ یہ تھا کہ خلافت اسلامیہ میں عربوں اور غیر عربوں سب کی نمائندگی ہونی چاہیئے۔ امیرالمومنین ہارون الرشید نے جو اپنے وقت کے سردار بنی ہاشم اور نمائندہ اہل اسلام تھے انھوں نے شاہ روم کو جو نصرانی دین کا نمائندہ تھا ایک مبسوط تبلیغی مراسلہ بھیجا، اس میں منقولی اور معقولی دلائل کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی منال دنیوی سے بے نیازی کے ثبوت میں بتایا گیا ہے کہ آپ نے اپنے خاندان کے

سیاسی تفوق کی قطعاً کوئی کوشش نہیں کی حالانکہ کرتے تو اسکی پذیرائی کیجاتی فرماتے ہیں۔ (عصر المامون، طبع ۱۹۲۷ء دار الکتب مصریہ طبع ثانی رسالہ ابی الربیع محمد بن ثابت")

لعمر اللہ لو اراد الملک لاقاد واراد طلب السلطان لذوی رحمۃ لوکد لھم عقداً لا یحل ولا برم لھم امراً لا ینقض ولا تل لھم فی عنفوان امرہ ملکا لا یخرج من ایدیھم ولا یبرح ابداً فیھم۔

بخدا اگر وہ (حضور صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے رشتہ داروں کی حکومت چاہتے اور عزیزوں کی حکومت کے خواہشمند ہوتے تو تاکید کے ساتھ عہد کو ایسا پختہ کر دیتے کہ اسے توڑا نہ جا سکتا اور بات کو ایسی مضبوط کر دیتے کہ ٹالی نہ جا سکتی اور ابتداء تحریک ہی میں انکی حکومت کی جڑیں ایسی گہری کر جاتے کہ وہ ان کے ہاتھ سے نہ نکلتی اور ہمیشہ انہی میں رہتی۔

کیا یہ بیان اس بارے میں شافی نہیں کہ بنو ہاشم اپنی حکومت کو خلافت کے شرعی فرمان کے تحت نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اسے انسانی کوششوں پر مبنی رکھا اور اسی اعتبار سے کامیابی یا ناکامی ہوئی جس کی کوشش تعمیری انداز میں رائے عامہ کو اپنے حق میں استوار کرنے پر مذکور رہی اسے کامرانی نصیب ہوئی اور جو صحیح بنیاد پر کھڑے نہ ہوئے نسبی تعلّیوں ہی پر جن کے پروپیگنڈے کا دارومدار رہا وہ ناکام رہے۔

چنانچہ محمد الارقط بن عبد اللہ حسنی، اور ان کے بھائی ابراہیم یا ایسے ہی دوسرے وہ علوی جو وقتاً فوقتاً خلفائے اسلام کے خلاف بغاوتیں اور خروج کرتے رہے، ان سب کی کوششیں انسانی اور سیاسی تھیں حکیم

الٰہی اور فرمانِ نبوی کا سہارا کسی نے نہیں لیا۔ اور نہ اپنے آپ کو معصوم
ان میں سے بعض نے جو مظالم ڈھائے اور اخلاقی جرائم کا ارتکاب کیا
امت سے اعلانیہ غداری کی تو اس پر معصومیت کا پردہ کسی نے نہ ڈ

زیدیہ کے ایک بہت بڑے عالم محمد بن الحسن دیلمی نے اپنی کتاب
قواعد عقائد آل محمد لکھی اس میں، اسماعیلیہ اور اثنا عشریہ
مذہب کا بطلان، ان لوگوں کے بارے میں ان کا مہلک غلو اور حضرات
صحابہ کرام رض کو راہِ حق سے ہٹا ہوا سمجھنا بیان کر کے بتایا ہے کہ زیدیہ کے
نزدیک یہ کفر محض ہے۔ چنانچہ وہ اپنی اس کتاب کی ابتدا ان کلمات سے
کرتے ہیں۔ (مطبعۃ السعادۃ مصر ۱۹۵۰ء) یہ کتاب امام یحییٰ حمید الدین
ہاں مخطوطے کی صورت میں تھی۔ اب اسے شائع کیا گیا ہے)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قبل الاشتغال ببیان مذہب الباطنیۃ نذکر طرفاً من مذہب الغلاۃ والمفوضۃ لانّھم منھم ایضاً۔ وذلک لان اصول مذہب الغلاۃ والمفوضۃ والباطنیۃ من الاسماعیلیۃ والامامیۃ الاثنا عشریۃ تختلط بعضھا ببعض فی کثیر من المسائل ولذلک قیل الامامیۃ دھلیز الباطنیۃ

باطنیوں کا مذہب بیان کرنے سے پہلے غالیوں اور مفوضوں کی بعض باتیں بیان کرنی چاہتے ہیں۔ کیونکہ وہ لوگ بھی انہی میں ہیں، وجہ یہ ہے کہ غالی ہوں یا مفوض، اسماعیلی باطنی ہوں یا اثنا عشری امامی، ان سب کے مذہب اصول بہت سے مسائل میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اسی لیے کہا گیا ہے کہ امامیہ کا مذہب باطنی مذہب کی دہلیز ہے۔ انہی کے ذریعہ

لان الكل دخلوا في الشيعة
من جهتهم وكلهم يدعون
التشيع ويغلون في الدين
ويخرجون من طريق المسلمين

لوگ شیعیت میں داخل ہوتے ہیں
اور سب کے سب تشیع کے مدعی
ہو کر دین میں غلو کرتے ہیں۔ اور
مسلمانوں کے طریق سے نکل جاتے ہیں۔

پھر آگے چل کر ص ۱۰۵ پر لکھتے ہیں۔

منها انهم يكفرون الامة
المسلمة باجمعها ويسمونهم الامة
المنكوسة اي عن رشدها
ويسمون الائمة والعلماء
والفضلاء من لدن النبي
صلى الله عليه وسلم الى
يومنا الطواغيت والاصنام....
فاول صنم من اصنام
الطاغوتية ابوبكر ثم عمر ثم
عثمان ومن كان مثلهم في
كل وقت وزمان.....
وهل هذا الا كفر صراح
وشرك محض؟

ایک وجہ یہ ہے کہ یہ تمام امت مسلمہ کو
کافروں کی جماعت کہتے ہیں اور ان کا
نام انھوں نے امت سرنگوں رکھا ہے
یعنی راہ راست چھوڑ دینے والی امت
پھر یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے
لیکر آجتک کے تمام ائمہ، علماء اور
فضلاء امت کو شیاطین اور اصنام
کہتے ہیں.... ان کے نزدیک شیطانی
بتوں میں پہلے بت ابوبکر ہیں پھر عمر اور
پھر عثمان اور انہیں کی طرح کے دوسرے
وہ سب حضرات جو کبھی اور کہیں پیدا
ہوئے ہوں..... کیا یہ تصور صریح
کفر اور شرک محض نہیں ہے؟

مفوضہ[1] اور غالیوں کے متعلق لکھتے ہیں کہ ان لوگوں کا عقیدہ یہ تھا

---

[1] شیعہ امامیہ کے مجتہد اعظم شیخ مفید نے اپنی مشہور کتاب "من لا یحضرہ الفقیہ" کے باب

ان اللہ تعالیٰ فوّض امر العالم الی الائمۃ الی علی والحسن و الحسین علیہما السلام وباقی الائمۃ من بعدھم وھم یخلقون ویرزقون ویمیتون و یحیون ویبعثون ویعاقبون ویثیبون۔

اللہ تعالیٰ نے کارجہاں ائمہ کے سپرد کر رکھا ہے یعنی حضرت علی حضرت حسن حضرت حسین علیہم السلام اور ان کے بعد آنے والے باقی اماموں کے۔ یہ لوگ پیدا کرتے ہیں، روزی دیتے ہیں، مارتے ہیں جلاتے ہیں مرنے کے بعد اٹھاتے ہیں عذاب دیتے ہیں اور جزا دیتے ہیں۔

امامیہ اثنا عشریہ اگرچہ اتنا تو نہیں کہتے مگر ان کے ہاں یہ عقیدہ عام ہے کہ جب حضرت علیؓ کو پکارا جاتا ہے تو وہ مدد کو آتے ہیں۔ اسی لئے "یا علی" کا نعرہ اور مصیبت کے وقت انھیں پکارنے کا طریقہ ان کے ہاں رائج ہے[1] اور نادعلی ان کے ہاں کا مشہور و مقبول وظیفہ ہے۔ ساتھ ہی صحابۂ کرام، امہات المومنین اور خلفاء اسلام پر لعنت ان کے ہاں عبادت کا درجہ رکھتی ہے شعبان کی پندرھویں شب آل ابی سفیان اور آل مروان رضی اللہ عنہم پر لعنت کرنے کے لئے ان کے ہاں خاص ہے اور اسے بڑا اثر ور وظیفہ سمجھا جاتا ہے۔

(بقیہ صفحہ ۱۵۵) الاذان ہیں صراحتاً بیان کیا ہے کہ مفوضہ ہی ہیں جو اذان میں حضرت علی کے ولی اللہ اور وصی رسول اللہ اور خلیفہ بلا فصل ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ الفاظ جزو اذان نہیں ہیں جو ان الفاظ کو جزو اذان سمجھ کر اس کو اذان کے وقت کہے اس پر اللہ کی لعنت ہو۔

[1] غیر شیعہ جہلا ء بھی شیعہ پروپیگنڈے سے یہ نعرہ لگا بیٹھتے ہیں۔

صحیح النسب علویین کے بعض طبقوں میں شیعی تصورات، خاندانی تعلّی
(ا)لنسبی بزرگی اور اپنے بزرگوں کی جناب میں غلو کا رواج اس وقت پڑا جب مشرق
(ا)ل مجوسی الاصل بویہی روافض اپنا سیاسی اقتدار قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے
(ص)حابۂ کرام پر لعن وطعن کا سلسلہ شروع ہوا۔ ماتم حسینؓ اور عید غدیر کا اہتمام سرکاری
(پ)ور پر کیا گیا اور حضرت علیؓ اور ان کی اولاد سے غیر معتدل عقیدت کا اظہار کیا
(جا)نے لگا۔ تاریخ کی چھوٹی بڑی ہر معتبر کتاب سے ثابت ہے کہ ان تمام بدعات
(و سئ)یئات کی ابتدار امیر الامراء معز الدولۃ اور اس کے بویہی خاندان نے کی، اس سے
(پہ)لے مسلمانوں میں ایسا کوئی تصور اور کوئی رواج نہ تھا۔ چنانچہ علامہ خضری
(ن)ے محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ میں الدولۃ العباسیہ کے تحت ص ۳۰۳
(پ)ر کتب تاریخ کا خلاصہ اس طرح پیش کیا ہے۔

قد کان اهل بغداد قبل الدولة	بویہی حکومت کے قیام سے پہلے اہل بغداد
البوهية على مذهب اهل	سب اہل سنت والجماعۃ کے مذہب پر
السنة والجماعة و يفضلون	تھے، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو
الشيخين ابى بكر و عمر على	سب صحابہ سے افضل سمجھتے تھے اور حضرت
سائرهم ولا يقدحون فى معاوية	معاویہؓ یا مسلمانوں کے دیگر بزرگوں
ولا غير من سلف المسلمين۔	میں سے کسی پر طعن نہیں کرتے تھے لیکن
فلما جاءت هذه الدولة	جب یہ حکومت قائم ہوئی جو غالی شیعہ
وهى متشيعة غالية نما مذهب	حکومت تھی تو بغداد میں مذہب شیعہ کو
التشيع ببغداد و وجد له	فروغ ہوا۔ اور حکومت کی پشت پناہی
من قوة الحكومة انصارا	سے اسے قوت ملی۔ چنانچہ ۳۵۱ھ
فقد كتب على مساجد بغداد	میں بغداد کی مسجدوں میں جو عبارت

سنہ ۳۵۱ھ ماصورتہٗ
"لعن اللّٰہ معاویۃ بن ابی سفیان
ولعن من غصب فاطمۃ فدکًا
ومن منع ان یدفن الحسن
عند قبر جدہ علیہ السلام
ومن نفی اباذر الغفاری ومن
اخرج العباس عن الشوریٰ"
والخلیفۃ کان محکومًا لا یقدر
علی المنع واما معز الدولۃ
فیامرہ کان ذٰلک فلما کان
اللیل حکہ بعض الناس فاراد
معز الدولۃ اعادتہ فاشار
علیہ وزیرہ ابو محمد المھلبی
بان یکتب مکانہ ما یجیٔ
"لعن اللّٰہ الظالمین لآل
رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و
سلم ولا یذکر احدًا فی اللعن
الا معاویۃ"

لکھی گئی اس کی صورت یہ تھی۔
خدا تعالیٰ معاویہ بن ابی سفیان کو اپنی
رحمت سے دور کرے، اور اس پر بھی
لعنت کرے جس نے فاطمہ سے فدک
چھین لیا اور جس نے حسن کو ان کے نانا
علیہ السلام کے پاس دفن نہ ہونے
دیا، اور اس پر جس نے ابوذر کو شہر بدر کیا
اور اس پر جس نے عباس کو شوریٰ میں
شامل نہیں کیا۔
خلیفۂ وقت محکوم تھے اور انہیں اس کے
روکنے کی قدرت نہ تھی یہ سب کام
معز الدولہ کے حکم سے ہوا تھا۔ جب
رات ہو گئی تو بعض لوگوں نے یہ عبارت
مٹا دی۔ معز الدولہ نے چاہا کہ دوبارہ
لکھوائے لیکن اس کے وزیر ابو محمد
المھلبی نے مشورہ دیا کہ اس کی بجائے
حسب ذیل عبارت لکھوا دے۔
"خدا ان ظالموں پر لعنت کرے جنہوں
نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد پر ظلم کیا۔ اور اس لعنت میں نام کسی کا
نہ لے سوائے معاویہ کے"
یہ لعنت حضرت صدیق اکبرؓ پر تھی۔ جن پر یہ افترا کیا گیا ہے کہ انھوں نے

سیدہ فاطمہؓ کو فدک سے محروم کر دیا۔ پھر یہ لعنت حضرت مروانؓ پر ہے جن پر یہ بہتان رکھا گیا ہے کہ انھوں نے حضرت حسنؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دفن نہیں ہونے دیا۔ حضرت ابوذرؓ کو شہر بدر کرنے کا جھوٹ حضرت عثمانؓ پر بولا گیا ہے، اور حضرت عباسؓ کو شوریٰ میں شامل نہ کرنے کا الزام حضرت فاروق اعظمؓ پر ہے۔

یوہی امیر الامرار کی حکومت خبیثہ کا جب خاتمہ ہو گیا تو خلفاء عباسیہ نے مستقل طور پر یہ عبارت لکھوا دی۔ مساجد بغداد کے منبروں پر۔

الا ان خیر الناس بعد رسول	یہ جان لو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	سلم کے بعد انسانوں میں سب سے بہتر
ابو بکر ثم عمر ثم عثمان ثم	ابوبکر ہیں پھر عمر پھر عثمان پھر علی
علی ثم معاویۃ خال المسلمین	پھر معاویہ مسلمانوں کے ماموں
رضی اللہ عنہم اجمعین	اللہ ان سب سے راضی ہو۔

قاضی ابوبکر ابن عربیؒ نے چھٹی صدی ہجری میں بغداد کی مسجدوں میں یہ عبارت لکھی ہوئی اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ یہ ردِ عمل تھا یوہی زندقہ والحاد کا ورنہ مسجدوں میں ایسی عبارت لکھوانے کی کیا ضرورت تھی۔ اہل ایمان تو اپنے تمام بزرگوں کا یکساں احترام کرتے ہی چلے آ رہے ہیں اور صحابہ کرام کے ساتھ جو عقیدت مسلمانوں کو ہے وہ دنیا میں دوسرے مذاہب کے لوگ اپنے اسلاف کے ساتھ کب رکھتے ہیں۔

یہی حال ان عبیدی ملاحدہ کا تھا جنھوں نے ادعائے فاطمیت کے ساتھ مصر میں حکومت قائم کی۔ ان کے متعلق تمام علمار تاریخ متفق ہیں کہ (تاریخ الخلفاء ص ۵ طبع مصر)

اکثرھم زنادقۃ خارجون عن الاسلام ومنھم من اظھر سب الانبیاء ومنھم من اباح الخمر ومنھم من امر بالسجود لہ والخیر منھم رافضی خبیث لئیم یامر بسب الصحابۃ رضی اللہ عنھم۔

ان میں اکثر زندیق ہیں اور اسلام سے خارج، ان میں سے بعض وہ ہیں جنھوں نے انبیاء علیہم السلام پر سب وشتم، بعض وہ ہیں جنھوں نے نشہ حلال کر دیا، ان میں وہ بھی ہیں جس نے اپنے آپ کو سجدہ کر دایا، اور ان میں جو سب سے اچھا تھا۔ وہ رافضی تھا خبیث تھا، مردود تھا، اور صحابہ پر لعنت کا حکم کرتا تھا۔

قال القاضی ابوبکر الباقلانی کان المھدی عبید اللہ باطنیا خبیثا حریصا علی ازالۃ ملۃ الاسلام اعدم العلماء والفقھاء لیتمکن من اغواء الخلق وجاء اولادہ علی اسلوبہ اباحوا الخمر والفروج واشاعوا الرفض

قاضی ابوبکر الباقلانی فرماتے ہیں مہدی عبید اللہ باطنی تھا خبیث تھا اور ملت اسلام کو مٹانے پر حریص تھا، اس نے علماء وفقہاء کو شہید کیا تاکہ مخلوق کو گمراہ کرنے کی طاقت اسے حاصل ہو جائے اور اس کی اولاد اسی کے طریقے پر چلی انھوں نے شراب نوشی اور زنا کاری حلال کر دی اور رفض کو فروغ دیا۔

وقال الذھبی کان القائم بن المھدی شرا من ابیہ زندیقا ملعونا اظھر سب الانبیاء۔ وقال وکان العبیدیون علی ملۃ الاسلام شرا من

امام ذہبی فرماتے ہیں قائم بن مہدی اپنے باپ سے بھی برا تھا، زندیق تھا ملعون تھا، انبیاء علیہم السلام

النتر
وقال ابو الحسن القابسی ان الذین قتلهم عبید الله و بنوه من العلماء والعباد اربعة آلاف رجل لیردوهم عن الترضی عن الصحابة فاختاروا الموت۔

گالیاں دیتا تھا۔ اور فرماتے ہیں، ملت اسلامیہ کیلئے عبیدی لوگ تاتاریوں سے بھی زیادہ برے تھے۔
ابوالحسن القابسی کہتے ہیں کہ عبیداللہ نے علماء اور صلحاء میں سے جن حضرات کو شہید کیا وہ چار ہزار تھے انھیں وہ صحابہ کیلئے دعا کرنے سے روکنا چاہتا تھا لیکن انھوں نے موت کو ترجیح دی

سلطان غازی صلاح الدین ایوبیؒ کے ہاتھوں اس دولت خبیثہ کا خاتمہ ہوا حسن بن صباح اسی دعوت کا داعی تھا، بے شمار علماء و فضلاء و فقہاء کا خون اس کی گردن پر ہے۔

بویہیوں اور عبیدیوں میں اگرچہ سیاسی اور مذہبی چشمک تھی مگر جہاں تک دین اسلام کو تباہ اور ملت اسلامیہ پر مصائب توڑنے کا مسئلہ ہے تو یہ دونوں حکومتیں ایک دوسرے کی معاون تھیں یہ سب روئداد صفحات تاریخ پر ثبت ہے۔ اور کسی تاویل کی اس بارے میں گنجائش نہیں۔

غرض یہ ہے کہ چوتھی صدی سے پہلے آل علیؓ میں ان عقائد کا شائبہ بھی نہ تھا۔ جو عجمی سرزمین میں پیدا ہوئے۔ قدمائے آل علی کا ان عجمی تصورات سے بیزار اور بری ہونے کا عملی ثبوت یہ ہے کہ وہ آپس میں اپنے تعلقات مستحکم رکھتے تھے اور خلافت قائمہ یعنی اموی اور عباسی خلفاء کے ساتھ بھی ان کے روابط شریعت کے مطابق قائم تھے۔ لیکن ان کی طرف منسوب ہونے والے عجمی فرقوں نے انھیں آپس میں بانٹ رکھا ہے۔ ہر فرقے کی

امامت کا سلسلہ الگ ہے اور سب کے سب اپنے اپنے ائمہ کو انہی صفات متصف سمجھتے ہیں جو شیعیت کے امتیازات ہیں، اور دوسرے سلسلے کو کاذب اور مدعی جانتے ہیں۔ اگر واقعی آل علی کو شیعی تصورات سے کچھ دلچسپی ہوتی اور ان کے ہاں امامت عرفی کا کوئی سلسلہ ہوتا تو ہر سلسلہ امامت کے لوگ ایک دوسرے کے حریف ہوتے اور ان میں یگانگت نہ پائی جاتی۔ شخصی اور انسانی حیثیت سے دوستی دشمنی یا رقابت و یگانگت اور بات ہے مگر دینی اعتبار سے دو متضاد نظریوں میں ہم آہنگی کا کوئی امکان نہیں۔ مثلاً یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک سلسلے میں علی بن حسین (زین العابدین) امام معصوم ہیں اور ان کا تقرر خدا کی طرف سے ہوا ہے اور دوسرے فرقے کے نزدیک یہی حیثیت ان کے چچا محمد بن علی بن ابی طالب (ابن الحنفیہ) کی ہے۔ اسی طرح امامیہ اثنا عشریہ کے ہاں خدا کی طرف سے امامت موسیٰ بن جعفر (الصادق) کو ملی۔ اور اسماعیلیہ کے نزدیک ان کے بڑے بھائی اسماعیل بن جعفر کو۔ پھر اسی طرح ان کے اور بھی سلاسل ہیں جن میں سے کچھ ختم ہو گئے اور کچھ باقی ہیں۔ خدا کی طرف سے تقرر اگر ایک کا ہوا ہے تو یقیناً دوسرے کا نہیں ہوا۔ اسی لئے یہ ایک دوسرے کی تکفیر کرتے ہیں۔ اگر اسی تکفیر کا سلسلہ آل علی کے مابین بھی ہوتا تو نہ ان میں نہ باہمی تعظیم و تکریم و مودت ہوتی اور نہ رشتہ داری یعنی سارا علم الانساب انہی کے ہاتھوں غارت ہو چکا ہوتا۔

امامیہ اثنا عشریہ کے ہاں بارھویں امام "محمد بن حسن" ہیں جن کی متعلق کہا جاتا ہے کہ بارہ سو برس سے غار میں چھپے بیٹھے ہیں اپنر سلسلہ امامت ختم ہو گیا۔ لیکن اسماعیلیہ کے ہاں امامت جاری ہے اور موجودہ کریم آغا خان

ان کے ایک فرقے کے نزدیک امام عصر ہیں اور ان تمام صفات سے موصوف جو اہلِ تشیع کے سب فرقوں کے نزدیک امام میں ہوتے ہیں۔

امام ابو حنیفہؒ یا امت مسلمہ کے دوسرے ائمہ کرام میں سے کسی کو اس قسم کے تصورات سے کیا علاقہ ہو سکتا تھا اور امامت کا یہ تصور ان کے نزدیک کسی درجے میں کب درست سمجھا جا سکتا تھا جب کہ سب کے ہاں کتاب اللہ، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اجماع صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر مدار کار ہے امام اعظمؒ تو شیعی تصورات رکھنے والوں سے اتنے بیزار تھے کہ انکی روایت قبول کرنے کے بھی روادار نہیں۔ چنانچہ خطیب بغدادیؒ نے الکفایہ فی علم الروایۃ میں اپنی سند سے عبداللہ بن المبارکؒ کے حوالے سے بیان کیا ہے (ص ۱۲۶ مکتبۃ السلفیہ، شیش محل لاہور)

سأل ابو عصمۃ ابا حنیفۃ عمن تأمرنی ان اسمع الاثار قال من کل عدل فی ھواہ الا الشیعۃ۔ قال واصل مذھبھم تضلیل اصحاب محمد صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم۔	ابو عصمہؒ نے ابو حنیفہؒ سے دریافت کیا آپ مجھے کن لوگوں سے روایت لینے کا حکم فرماتے ہیں" فرمایا" ہر معتبر ثقہ شخص سے اگرچہ وہ عقائد میں جماعت سے ہٹا ہوا ہو، سوائے شیعہ کے" پھر فرمایا" ان کا (شیعہ کا) اصل عقیدہ یہ ہے کہ اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گمراہ ثابت کریں۔

پھر یہی خطیبؒ ص ۱۲۵ - ۱۲۶ پر فرماتے ہیں؛

قد اسلفنا الحکایۃ عن ابی عبداللہ الشافعی فی جواز	ہم نے پہلے ابو عبداللہ الشافعی (الامام) کی یہ بات بیان کی ہے کہ ہوا پرست

قبول شهادة اهل الاهواء غير صنف من الرافضة خاصة ويحكى ذلك عن ابی حنيفة امام اصحاب الرای وابی یوسف القاضی۔

لوگوں کی روایت قبول کی جا سکتی سوائے رافضیوں کے خاص طبقے یہی بات امام اصحاب الرای ابو حنیفہ سے نقل کی گئی ہے اور قاضی ابو یوسف سے۔

امام اعظمؒ کی پہلی ملاقات جب حضرت عطاء بن ابی رباحؒ سے ہوئی اور طلب علم کے لئے آپ نے ان کی خدمت میں رہنا چاہا، تو اس کا حال ابن بطالؒ نے شرح بخاری میں اس طرح لکھا ہے (تفسیر المنار ج ۸ ص ۲۱۵ طبع مصر)

عن ابی حنيفة انه قال لقيت عطاء بن ابی رباح بمكة فسألته عن شیء فقال "من این انت؟" قلت "من اهل الكوفة" قال "انت من اهل القرية الذی فرق قوادينهم وكانوا شيعا؟" فقلت "نعم" قال من ای الاصناف انت؟ قلت ممن لا يسب السلف ويؤمن بالقدر ولا يكفر احدا بذنب" فقال عطاء "عرفت فالزم"

ابو حنیفہؒ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں میں نے مکہ میں عطاء بن ابی رباح سے ملاقات کی اور ان سے کچھ سوال کئے انھوں نے پوچھا "تم کہاں کے ہو" میں نے عرض کیا "کوفے کا" فرمایا تم اس بستی کے ہو جہاں کے لوگوں نے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے؟" میں نے کہا "جی" فرمایا "ان میں سے کسی گروہ سے تمہارا تعلق ہے؟" میں نے عرض کیا "ان سے جو بزرگان سلف کی جناب میں بے ادبی نہیں کرتے، تقدیر پر ایمان

رکھتے ہیں۔ اور گناہ کے سبب کسی کو کافر نہیں کہتے۔ فرمایا "تمہیں دین کا عرفان ہے۔ اسی پر جمے رہو"

یہاں سے معلوم ہوا کہ اپنے مشائخ کرام کے طریقے پر امام صاحب کا شروع سے یہ مذہب تھا کہ سب صحابہ کرام کی تعظیم کریں، ان کے اختلافات میں فریق نہ بنیں تقدیر پر ایمان رکھیں اور معاصی پر کسی کی تکفیر نہ کریں یعنی نہ رافضی ہوں اور نہ منکرین قدر ہوں اور نہ خوارج۔ بلکہ پوری طرح جماعت سے وابستہ رہیں اور سنت کا اتباع کریں۔ یہی امت کے سواد اعظم کا مسلک ہے اور اسی سواد اعظم کے عظیم ترین ائمہ میں امام اعظم ابو حنیفہ ہیں۔ ان کی اس سے بڑی کوئی ہتک نہیں ہو سکتی کہ انھیں کسی فرقے سے منسوب کیا جائے یا خلفاء اسلام سے بے تعلق بتایا جائے۔ یا جمل و صفین جیسے سیاسی جھگڑوں میں کسی کو اچھا برا کہنے والا سمجھا جائے یا ان کی ہمدردیاں ایسے لوگوں کے ساتھ بتائی جائیں جنھوں نے امت کا کلمہ متفرق کرنا چاہا۔ اور اپنے عہد کے متفق علیہ خلیفہ کے خلاف بغاوت کی۔ امام اعظم کے سامنے ان کے شیخ اکبر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا عمل تھا۔ جو جمل و صفین کے معاملات میں غیر جانبدار رہے اور افتراق امت کو پسند نہ کیا۔ اسی لئے انھوں نے حضرت علیؓ سے بیعت نہیں کی، کیونکہ جماعت المسلمین اور امت کے سواد اعظم نے ان کی خلافت پر اجماع نہیں کیا تھا۔ اور اسی طرح انھوں نے ابن الزبیرؓ سے بھی بیعت نہیں کی لیکن امیر المؤمنین معاویہؓ امیر المؤمنین یزید۔ امیر المؤمنین عبدالملک اور امیر المؤمنین الولید سے بیعت کی۔ اپنے تابعی شاگرد امیر المؤمنین عبدالملک سے آپ نے بیعت جن الفاظ میں تحریر کے ذریعہ کی وہ موطا امام مالک اور صحیح بخاری میں مذکور ہے (صحیح بخاری ج ۴ ص ۲۴۵ باب کیف یبایع الامام الناس)

الی عبد اللہ عبد الملک امیر المؤمنین انی اقر بالسمع و الطاعۃ لعبد اللہ عبد الملک امیر المؤمنین علی سنۃ اللہ وسنۃ رسولہ فیما استطعت وان بنی قد اقروا لک۔

بجناب بندۂ خدا عبد الملک امیر المومنین میں اللہ کی مقرر کردہ سنت اور اس کے رسول کی سنت پر اللہ کے بندے عبد الملک امیر المومنین کا فرمان سننے اور اسے حتی المقدور بجا لانے کا اقرار کرتا ہوں ایسا ہی اقرار میرے فرزندوں نے بھی کیا ہے۔

پھر امام ابو حنیفہؒ کے سامنے اپنے دوسرے شیخ اعظم حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کا بھی یہ عمل تھا کہ وہ اگرچہ حضرت علیؓ کے ساتھ تھے ہر طرح ان کی مدد کی مگر انھوں نے بیعت سے لے کر صفین کے معرکے تک بار بار انھیں روکنے کی کوشش کی اور ان اقدامات کے خطرات سے آگاہ کیا۔ اور اس ٹولی سے محترز رہنے کی تلقین کی جس نے اس امت میں سارا فسادکھڑا کیا تھا، لیکن بوجہ چھوٹے بھائی ہونے کے ساتھ چھوڑنے کی جرأت نہ کی۔ ورنہ حقیقی جذبات ان کے وہی تھے جو ان کے سب سے بڑے بھائی حضرت عقیلؓ کے تھے۔ اسی لئے انھوں نے حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد حضرت معاویہؓ کو خط بھیجدیا تھا کہ ہم اب اختلاف ختم کر کے آپ سے صلح اور بیعت کے لئے تیار ہیں۔ عجب نہیں کہ حضرت معاویہؓ نے حضرت حسنؓ کو جو صلح اور بیعت کی دعوت دی (صحیح بخاری کتاب الصلح) وہ حضرت ابن عباسؓ کے اسی مراسلے کے سبب ہو۔ حضرت حسنؓ اور حضرت معاویہؓ کے مابین حضرت ابن عباسؓ نے صلح نامہ مرتب کر کے بحیثیت گواہ اپنے دستخط کئے تھے[1] پھر انھوں نے امیر المؤمنین یزیدؒ کی ولایت عہد لو

---

[1] دار المصنفین اعظم گڈھ نے کام تو بہت کیا مگر تاریخی اعتبار سے ا باقی ص ۱۶۷ پر

اور خلافت کی بیعت کی اور اس پر مستقیم رہے۔ حرّہ کے ہنگامے سے بنو ہاشم کو الگ رکھا۔ ابن الزبیرؓ سے بیعت نہیں کی اور آپ ہی کے فرمان پر بنو ہاشم سب کے سب امیر المؤمنین عبدالملکؒ کی بیعت میں داخل ہو گئے۔ حضرت ابن عباسؓ کو اموی خلافت کے قیام کا انتظار تھا۔ اور وہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ امیر المؤمنین عبدالملک کامیاب ہو جائیں گے جیسا کہ صحیح بخاری سے معلوم ہوتا ہے (ج ۲ کتاب التفسیر ص ۱۲۶ باب قولہ ثانی اثنین اذ ہما فی الغار) حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ

(بقیہ ص ۱۶۶) سطحی اور اغلاط سے پُر۔ حضرت ابن عباسؓ کے احوال میں کہا گیا ہے کہ صفین کے معرکوں میں وہ بڑی بہادری سے لڑے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ نہ جمل میں ام المؤمنین صلوٰت اللہ علیہا کے خلاف معرکہ آرا ہوئے اور نہ صفین میں۔ وہ بصرے کے والی تھے اور شروع سے آخر تک رہے۔ میدان جنگ میں ان کے آنے کا موقعہ ہی کیا تھا۔ اسی طرح آل عباس میں سے کسی کا حقیقی جنگ میں شریک ہونا ثابت نہیں کیونکہ وہ سب مختلف علاقوں کی حکومت پر فائز تھے۔ البتہ یہ ہے کہ جنگ جمل میں جب باہمی صلح ہو گئی۔ تو حضرت علیؓ کی طرف سے حضرت ابن عباسؓ نے بطور ضامن کے اصحاب جمل کے ہاں رات گزاری اور حضرت محمد بن طلحہؓ نے اصحاب جمل کی طرف سے لشکر مرتضوی میں (منہاج السنۃ، البدایہ والنہایہ نیز طبری) اسی طرح صفین کے بعد ثالثوں کا فیصلہ سننے کے لئے جو اجتماع ہوا تھا اس میں حضرت علیؓ کی طرف سے چار سو نمائندوں کی قیادت حضرت ابن عباسؓ نے کی اور آپ ہی نے انھیں نماز پڑھاتے تھے پھر حضرت حسنؓ اور حضرت معاویہؓ کے مابین صلح نامہ مرتب کرنے میں آپ نے شرکت کی، غرض ان جنگوں میں تعمیری موقف حضرت ابن عباسؓ ہی کا نظر آتا ہے اور آپ مسلمانوں کے مابین کشت و خون پسند نہیں کرتے تھے اور یہی موقف حضرت حسنؓ کا تھا، نیز حضرت محمد بن طلحہؓ اور حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن العاص کا۔

واللہ ان وصلونی وصلونی من قریب وان ربّونی ربّنی اکفاء کرام۔ فآثر التویتات والاسامات والحمیدات یرید ابطنا من بنی اسد بنی تویت و بنی اسامہ و بنی اسد ان ابن ابی العاص یرز یمشی القدمیۃ یعنی عبد الملک بن مروان وانہ لوّی ذنبہ یعنی ابن الزبیر

بخدا اگر (بنو امیّہ) میرے ساتھ صلہ رحمی کریں تو یہ صلہ رحمی قریب ترین عزیزوں کیطرف سے ہوگی۔ اور اگر وہ میری پرورش کریں گے (تو) یہ پرورش ذی احترام ہم چشموں کیطرف سے ہوگی تو پھر میں تویتات، اسامات اور حمیدات کو کیوں ترجیح دوں (آپ کی مراد بنو تویت، بنو اسامہ اور بنو اسد سے تھی) اور یہ جو ابو العاص کے فرزند ہیں یہ مردانہ وار بڑھ رہے ہیں یعنی عبد الملک بن مروان اور یہ جو صاحب ہیں انھوں نے اپنی دم سکیڑ رکھی ہے یعنی ابن الزبیرؓ

لیکن یہ فتح آپ کی زندگی میں انھیں حاصل نہ ہوئی۔ اسی لئے آپ نے اپنے فرزندوں کو اپنی وفات کے وقت وصیّت کی تھی کہ سب شام چلے جائیں اور ابن الزبیرؓ کی حکومت میں نہ رہیں۔ چنانچہ یہ حضرات چلے گئے۔ امام بن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں۔ (فتح الباری ج ۸ ص ۲۶۴) فلحق علیّ بعبد الملک فکان آثر الناس عندہ۔ (حضرت علی بن عبد اللہ بن عباسؓ امیر المؤمنین عبد الملکؒ کے پاس چلے گئے اور وہ آپ کے ہاں نہایت درجہ مقرب تھے) اسی طرح حضرت محمد بن علی بن ابی طالب (ابن الحنفیہ) نے امیر المؤمنین یزیدؒ سے دونوں بیعتیں کی تھیں۔ اہل مدینہ کی بغاوت میں شریک نہیں ہوئے۔ ابن الزبیرؓ سے بیعت نہیں کی اور التوابون اور مختار ثقفی نے خون حسینؓ کا بدلہ لینے کے بہانے جو تحریکیں چلائیں ان سے قطعاً لے تعلق رہے اور امیر المؤمنین عبد الملکؒ سے بیعت کی۔ آپ کے بیعت نامے سے ان تمام

خرافات کی تکذیب ہو جاتی ہے جنھیں اس سلسلے میں تاریخ کو مسخ کرنے والوں نے اچھالا ہے۔ آپ کا بیعت نامہ یہ تھا۔

بسم الله الرحمن الرحيم لعبد الله عبد الملك امير المؤمنين من محمد بن علي اما بعد فاني لما رأيت الامة قد اختلفت اعتزلتهم. فلما افضى هذا الامر اليك وبايعك الناس ورأيت الناس قد اجتمعوا عليك كنت كرجل منهم ادخل في صالح ما دخلوا فيه فقد بايعتك وبايعت الحجاج لك وبعثت اليك ببيعتي ونحن نحب ان تؤمننا وتعطينا ميثاقا على الوفاء

بسم اللہ الرحمن الرحیم، بندۂ خدا عبد الملک امیر المؤمنین کی خدمت میں منجانب محمد بن علی۔ اما بعد میں نے جب دیکھا کہ امت میں اختلاف پڑ گیا ہے تو ان سب سے الگ ہو کر بیٹھ گیا، پھر جب معاملہ آپ کے ہاتھ میں آیا لوگوں نے آپ سے بیعت کر لی اور میں نے دیکھا کہ سب نے آپ پر اجماع کر لیا تو میں نے بھی اپنے آپ کو انہی میں کا ایک فرد سمجھا اور جس نیک کام میں وہ شریک ہو گئے میں بھی شریک ہوتا ہوں میں نے آپ سے بیعت کر لی ہے یعنی آپ کی بیعت حجاج کے ہاتھ پر کر لی اور اپنا یہ بیعت نامہ آپ کو بھیج رہا ہوں۔ ہم کو محبوب ہے کہ آپ ہمیں امان دیں اور عہد پورا کرنے کا ہم سے وعدہ کریں۔

امیر المؤمنین عبد الملکؒ نے اس بیعت نامے کے جواب میں لکھا۔

انك عندنا لمحمود. انت احب واقرب الينا رحما من ابن الزبير فلك العهد والميثاق

آپ ہمارے نزدیک قابل ستائش ہیں ابن الزبیرؓ کے مقابلے میں نسبتاً ہم سے قریب تر ہیں اور ہمیں محبوب

وذمۃ اللہ ورسولہ ان لا تھاج ولا احد من اصحابک بشیٔ تکرھہ۔ ارجع الی بلدک واذھب حیث شئت ولست ادع صلتک وعونک ماحییت۔"

ہیں آپ کے ساتھ ہمارا عہد و پیمان ہے اللہ کا ذمہ ہے اور اس کے رسول کا ذمہ ہے آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو ایسی کوئی بات نہیں پہنچائی جائے گی جو آپ کو ناگوار ہو۔ آپ اپنے شہر کو واپس ہو جائیے اور جب جی چاہے جائیے۔ میں زندگی بھر آپ کی مدارات اور آپ کی امداد سے دریغ نہیں کروں گا۔

وکتب الی الحجاج یأمرہ بحسن جوارہ واکرامہ فرجع ابن الحنفیۃ الی المدینۃ وبھا دارًا واقام بھا۔

پھر (امیر) حجاج کو آپ نے ان کے ساتھ خوش معاملگی اور احترام کا حکم نامہ بھیجا۔ چنانچہ جناب محمد بن علی (ابن الحنفیہ) مدینہ طیبہ واپس ہوئے اور وہاں ایک گھر بنا کر مقیم ہو گئے۔

امام ابو حنیفہؒ کو صحابہ کرام اور بنی ہاشم (آل بیت) کا طرز عمل معلوم تھا کہ اموی خلافت کے خلاف خروج کو وہ ناجائز سمجھتے تھے اور ان ہنگاموں سے انھوں نے کوئی دلچسپی نہیں لی جو ابن الزبیرؓ کی حکومت قائم کرنے یا خون حسینؓ کا بدلہ لینے کے نام سے جاری کی گئیں بلکہ ان تحریکوں سے انھوں نے بیزاری ظاہر کی۔ جمہور صحابہ اور آل بیت اور اپنے دونوں عظیم شیخوں کے اس عمل کی موجودگی میں ان کی ہمدردیاں ان لوگوں کے ساتھ کیسے ہو سکتی تھیں جنھوں نے خلافت قائمہ کے خلاف خروج کیا۔ وہ حضرت ابن عمرؓ کے اس ارشاد کو کیسے فراموش کر سکتے تھے۔ جو صحیح بخاری میں مذکور ہے (ج ۲

کتاب الفتن)

وانی لا اعلم غدرًا اعظم من ان نبایع رجلا علی بیع اللہ ورسولہ ثم ننصب لہ القتال۔

مجھے اس سے بڑا کوئی غدر نظر نہیں آتا کہ ہم اول تو ایک شخص کے ہاتھ پر خدا و رسول کی بیعت کریں اور پھر اس سے لڑنے کے لئے پڑ جائیں۔

امیر المؤمنین یزیدؒ کے خلاف ابن الزبیرؓ کی حمایت میں اہل مدینہ نے جو بغاوت کی اور حرّہ کا افسوسناک اور تباہ کن حادثہ پیش آیا اس کے متعلق البدایہ والنہایہ میں حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ فرماتے ہیں (ج ۸، ص ۲۰۸)

واعتزل الناس علی بن الحسین وکذلک عبد اللہ بن عمر بن الخطاب لم یخلعا یزید ولا من بیت ابن عمر وکذلک لم یخلع یزیدًا احد من بنی عبد المطلب

(حضرت) علی بن الحسین (زین العابدین) ان لوگوں سے (یعنی باغیوں سے) الگ رہے اور اسی طرح (حضرت) عبد اللہ ابن عمرؓ بن الخطاب بھی، ان دونوں نے (امیر المؤمنین) یزید کی بیعت نہیں توڑی، اور نہ (حضرت) ابن عمرؓ کے گھرانے والوں نے، اسی طرح آل عبد المطلب (یعنی بنو ہاشم) میں سے بھی کسی نے بیعت نہیں توڑی۔

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں (ص ۲۳۳)

وقد کان عبد اللہ بن عمر بن الخطاب وجماعۃ اہل بیت النبوۃ ممن لم ینقض العہد ولا بایع احدًا بعد

(حضرت) عبد اللہ بن عمرؓ بن الخطاب اور اہل بیت نبوت (یعنی بنی ہاشم) کے سب لوگ ان میں ہیں جنھوں نے عہد نہیں توڑا اور (امیر المؤمنین) یزیدؒ سے بیعت

کرنے کے بعد ان کی زندگی میں) کسی سے بیعت نہیں کی (اور ان کے بعد حضرت ابن الزبیرؓ سے بھی بیعت نہیں کی)

امام ابوحنیفہ کے یہ دونوں شیخ جو اجلہ صحابہ میں ہیں ان کا عمل ان کے سامنے تھا اور انہی کے نظریات کے تحت ان کی پرورش ہوئی تھی تو یہ کیسے ممکن تھا کہ ان میں شیعیت کی کوئی رمق آسکے۔ علاوہ ازیں تابعین عظام میں جو ان کے اساتذہ ہیں یعنی قاضی شریحؒ (م ۸۰ھ) علقمہؒ (م ۶۲ھ) مسروق بن الاجدعؒ (م ۶۴ھ) اور اسود ابن زیدؒ (م ۹۵ھ) جو خاص حادثہ کربلا کے وقت کوفے میں موجود تھے۔ ان میں سے کسی نے جمہور صحابہ کرام کے موقف کے مطابق حضرت حسینؓ کے اقدام کی حمایت نہیں کی تا آنکہ خود حضرت حسینؓ نے کوفے پہونچنے سے پہلے ہی جب وہاں کے حالات معلوم کرلئے کہ عراق پوری طرح امیر المؤمنین یزیدؒ کی بیعت پر مجتمع ہے اور سبائیوں نے جو کچھ بیان کیا تھا وہ سب جھوٹ تھا تو آپ نے اپنے موقف سے رجوع کا اعلان کر دیا اور امیر المؤمنین یزیدؒ سے بیعت کرنے کے لئے کوفہ کی راہ سے پلٹ کر براہِ کربلا دمشق کی طرف چل پڑے۔ لیکن آپ کے ساتھ جو ساٹھ سبائی تھے۔ اور جو مکہ مکرمہ سے آپ کو سبز باغ دکھا کر اپنے ساتھ لائے تھے ان کے سبب حادثہ کربلا رونما ہوا۔ اس حادثہ کی ذمہ داری ہم عصر امت نے حکومت پر نہیں ڈالی یعنی نہ عمر بن سعد پر نہ امیر عبیداللہ پر چہ جائیکہ وہ امیر المؤمنین یزیدؒ کو اس کا ذمہ دار ٹھیراتے۔ حتی کہ ابن الزبیرؓ نے امیر المؤمنین کے خلاف جب بغاوت کروائی تو انھوں نے بھی ان کے معائب ومظالم میں خونِ حسینؓ کا نام نہیں لیا۔ اور لیتے بھی کیسے جب انھیں صحیح صورت معلوم ہوئی تھی اور وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ اس بغاوت میں کوئی ہاشمی شریک

نہیں ہو رہا۔ کیونکہ حضرت حسین کے آخری موقف کی پذیرائی میں وہ حضرات جو حادثہ کربلا کے بعد زندہ بچے تھے انھوں نے دمشق جا کر امیر المؤمنین یزید سے بیعت کر کے حضرت حسینؓ کا منشا پورا کر دیا۔ اسی لئے وہ سب حضرات اپنی بیعت پر مستقیم رہے اور ابن الزبیرؓ کی خاطر بیعت توڑنے پر تیار نہیں ہوئے اسی طرح امام اعظمؒ کے اساتذۂ کرام جو عہد مرتضوی میں موجود تھے انھوں نے صفین کی جنگ میں حصہ نہیں لیا اور غیر جانب دار رہے اسی طرح جو اساتذہ ان کے حادثہ کربلا کے وقت کوفے میں موجود تھے انھوں نے حضرت حسینؓ کا ساتھ نہ دیا۔ اور ان کے خروج کو جائز نہ جانا۔ وہ مسلمانوں کے ان دو بڑے گروہوں کے اختلاف میں فریق بننے کے لئے تیار نہ تھے۔ حضرت علقمہ رحمۃ اللہ جنگ صفین میں شریک ہوئے اور ایک ٹانگ سے معذور ہو گئے مگر پھر سیاست میں عملاً کبھی حصہ نہیں لیا اور علمی مشاغل ہی سے سروکار رکھا۔ اسی لئے امیر المؤمنین یزیدؒ کی بیعت توڑ کر حضرت حسینؓ کا ساتھ دینے سے بھی انھوں نے گریز کیا۔

ان حقائق تاریخیہ کی موجودگی میں وہ سب تصورات پا در ہوا ثابت ہوتے ہیں جو روایات واہیہ کے ذریعہ امام ابو حنیفہؒ کو کسی درجہ کی شیعیت سے متہم کرنے کے لئے وضع کئے گئے۔ اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں اپنے مذہب کی تدوین میں خود امام صاحبؒ کا عمل۔ امیر المؤمنین ابو جعفر المنصورؒ کا فرمان اور اس کا امام صاحب کی طرف سے جواب اوپر نقل کیا جا چکا ہے کہ آپ کے ہاں استخراج مسائل کا کیا طریقہ تھا اور یہ کہ قیاس کو حدیث پر آپ کے ہاں مقدم نہیں رکھا جاتا۔ یہی بات خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں امام صاحب کے طریقۂ اجتہاد کی خود انکی زبانی اس طرح بیان کی ہے۔

"اول میں مسئلہ کتاب اللہ سے لیتا ہوں۔ اس میں نہ ملے تو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیکھتا ہوں۔ اگر دونوں میں نہ ملے تو پھر آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم کے اقوال دیکھتا ہوں ان میں سے جس کا قول چاہتا ہوں۔ چھوڑ دیتا ہوں لیکن ان کے اقوال سے باہر نہیں جاتا۔ پھر بات اگر ابراہیم شعبی پر آپڑے یا ابن سیرین، حسن بصری، عطاء، سعید بن المسیب پر اور ایسے ہی آپ نے دوسرے نام لئے تو پھر میں بھی اسی طرح اجتہاد کرتا ہوں جیسے ان حضرات نے کیا۔

اب سوچنا چاہئے کہ جو شخص اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال سے باہر جانے پر تیار نہ ہو اور ان کے اجماع کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حجت شرعیہ جانے وہ ان کے کسی اجماعی فیصلے کو باطل کیسے کہہ سکتا ہے۔ اموی خلافت صحابہ کرام کے اجماع سے قائم ہوئی تھی اور اس خلافت کے کارکنوں میں ہمیں صحابہ کرام کے اسماء گرامی امیر المومنین ولید اول تک ملتے ہیں اور عباسی خلافت تو قائم ہی ہوئی تھی تمام امت کے اجماع سے۔ ایسی صورت میں نہ آپ اس خلافت کی حجیت پر شبہ کر سکتے تھے۔ نہ امیر المومنین ابو جعفر المنصورؒ کی اطاعت سے منہ موڑ سکتے تھے اور نہ ان خلفاء کے خلاف کھڑے ہونے والے کسی شخص کا نظری یا عملی حیثیت سے ساتھ دے سکتے تھے۔

ان مؤلفوں اور مصنفوں کو سبائی روایات اپنی کتابوں میں درج کرتے وقت غور کرنا چاہئے تھا کہ جس امام کا مذہب کتابی صورت میں خود اسکے اپنے شاگردوں کے ہاتھوں میں مدون ہے اور تین چوتھائی امت جس مذہب

لی پابند ہے، اس امام کے بارے میں ایسی روایات کیسے قبول کی جا سکتی ہیں جو خود اس کے مذہب اس کے اساتذہ کے مذہب اور اس کے تلامذہ کے مذہب کے خلاف ہیں۔ یہ روایات اگر کسی درجے میں صحیح ہوتیں تو کیا مذہب حنفی کو خلفاء اسلام کے ہاں سرکاری حیثیت حاصل ہو سکتی تھی؟ اور یہ امر مسلّم ہے کہ خلافت عباسیہ کا نظام قانون فقہ حنفی پر قائم تھا یہی وجہ ہے کہ مصر کے عبیدی ملاحدہ کی حکومت میں اہل السنۃ کے معاملات کے لئے شافعی اور مالکی قاضیوں کو تو مقرر کیا گیا۔ کسی حنفی المذہب کو وہاں قاضی بنانے کی اجازت نہ تھی۔ کیونکہ عبیدیوں کے نزدیک وہ خلافت عباسیہ کا مذہب تھا۔

اخذ روایت میں سختی۔

علماء حدیث میں بعض حضرات کے ہاں اہل ہوا و بدعت سے اخذ روایت میں نرمی ہے اور بعض کے ہاں سختی۔ امام اعظمؒ ان میں ہیں جن کے ہاں اس بارے میں سختی ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا اور خصوصیت کے ساتھ یہ سختی ان لوگوں کے حق میں زیادہ ہے جن میں تشیّع پایا جاتا ہو۔ کیونکہ تشیّع سے آدمی جمل و صفین میں فریق بن جاتا ہے۔ اور حادثہ کربلا کو غیر معمولی اہمیت دیکر جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی جناب میں سوءِ ظن کا مرتکب ہوتا ہے۔ کیونکہ کسی صحابی نے بھی حضرت حسینؓ کے خروج کی حمایت نہیں کی اور سب صحابہ نے جو ان سے ملے انھیں اس اقدام سے روکا۔ تاآنکہ انھوں نے کوفہ پہونچکر اپنے موقف سے رجوع کر کے امیر المؤمنین یزیدؒ سے بیعت پر آمادگی کا اعلان کرتے ہوئے کوفے کے راستے سے پلٹ کر براہِ کربلا دمشق جانے لگے تھے کہ انکے ساتھ ساتھ کوفیوں کی غداری سے یہ سانحہ پیش آ گیا۔

گویا تشیّع اپنے لوازمات کے ساتھ حضرت حسینؓ اور آپ کے فرزند ارجمند
دوسرے اعزّہ واقربار کے مواقف کے خلاف ایک تحریک ہے۔ اسے اوّل
التوابون نے تین برس کی خاموشی کے بعد اختلال کے زمانے میں جاری کیا
اور پھر مختار ثقفی نے، اور نام لیا۔ خونِ حسینؓ کے انتقام کا۔ لیکن نہ بنو ہاشم
ان تحریکوں سے کوئی دلچسپی لی اور نہ صحابۂ کرام نے بلکہ سب ہم عصر امت
ان کے قائدین کو گمراہ جانا اور کذاب کہا۔ پھر تین سو برس تک اسلامی
معاشرے میں اس حادثے کا کوئی ذکر نہ تھا۔ سوائے اس دلی رنج اور صدمہ
کے جو ایسی قیمتی اور بے بہا جانیں ضائع ہونے پر ہر مؤمن محسوس کرتا ہے
صرف اہلِ تشیّع کے ہاں ذکر ہوتا ہوگا۔ جیسا کہ ابو مخنف کی تحریروں سے پتہ
چلتا ہے اور طبری وغیرہ نے اس کی خرافات نقل کر کے اپنی تاریخ کے اوراق
سیاہ کئے ہیں۔ مگر یہ بات کتابوں کی حد تک رہی۔ اسے اہمیت تو چوتھی صدی
ہجری میں بویہی روافض نے دی جیسا کہ پچھلے اوراق میں مذکور ہوا۔ ا
صفحات دہر پر ثبت ہے۔

اسی لئے اہلِ تشیّع سے روایت لینے میں امام اعظمؒ کی جو سختی ہے ا
امام شافعیؒ بھی شریک ہیں۔ جیسا کہ الکفایہ کے حوالے سے بیان ہوا
اب طبقات الشافعیۃ الکبریٰ سے یہ سختی اور بھی نمایاں ہو جاتی ہے (ج
ص ۲۵۱، طبع مصر)

قال الشافعی فی الرافضی یحضر
الوقعۃ لا یعطی من الفیٔ شیٔ
لان اللہ تعالیٰ ذکر آیۃ الفیٔ
ثم قال والذین جاؤا من بعدھم

اس رافضی کے بارے میں جو غنیمت
فیٔ کی تقسیم کے وقت حاضر ہوا امام شافعیؒ
فرماتے ہیں کہ اسے اس میں سے حصہ نہ د
اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے آیۃ فیٔ کے

فمن لم یقل بہا لا یستحق ۔ فرمایا ہے "اور جو لوگ ان کے (یعنی
مہاجرین وانصار کے) بعد آئے کہتے ہیں (خدایا ہماری بھی پردہ پوشی فرما اور ہمارے
ان بھائیوں کی بھی جو ایمان کے ساتھ ہم سے پہلے گزر گئے اور ہمارے دلوں میں
اہل ایمان کی طرف سے کدورت مت رہنے دے ۔ خدایا تو ہی ہے دلوں میں
رافت ورحمت پیدا کرنے والا) تو جو شخص یہ نہ کہے اسے رثے میں حصہ لینے
کا کوئی حق نہیں ۔

الکفایہ فی علم الروایہ میں ہے (ص ۱۳۱) کہ حضرت عبداللہ الاخرم حافظ
حدیث سے پوچھا گیا کہ امام بخاریؒ نے ابوالطفیل عامر بن واثلہ کی کوئی روایت کیوں
نہیں لی تو فرمایا لانہ کان یفرط فی التشیع (اس لئے کہ ان میں تشیع بہت
زیادہ تھا) یہ عامر بن واثلہ صغار صحابہ میں ابن الزبیرؓ اور امیر المومنین مروانؓ
اوّل کے طبقے میں ہیں۔ صفین میں حضرت علیؓ کے ساتھ تھے۔ اور پھر کوفے
میں رہ گئے تو ان میں تشیع آگیا۔ امام بخاریؒ نے حضرت ابن الزبیرؓ اور حضرت
مروانؓ کی روایات اور فتاویٰ صحیح میں درج کئے ہیں لیکن عامر بن واثلہ کی
روایت لینے سے احتراز کیا حالانکہ انکا تشیع محض نظری تھا اور وہ اس لئے
تیار نہیں ہوئے کہ قواعد شرعیہ توڑ کر متفق علیہ امام کی بیعت فسخ کر دیں، وہ
حادثہ کربلا کے وقت کوفے میں موجود تھے اور خروج میں حضرت حسینؓ کا
ساتھ نہیں دیا۔

مواقف اقربائے حسینؓ

حادثہ کربلا کے عینی شاہد علی بن الحسین (زین العابدینؒ) ہیں نیز ان کے سگے بھتیجے اور
ابن عم حسن بن الحسنؒ اور دوسرے ابن عم زید بن الحسنؒ اور تیسرے ابن عم عبید اللہ
ابن العباس بن علی بن ابی طالبؓ وغیرہم۔ ان کے علاوہ سیدہ زینب بنت علیؓ

تھیں جنھیں حضرت حسینؓ کا اس سفر میں ساتھ دینے کے سبب ان کے شوہر حضرت عبداللہ ابن جعفرؓ نے طلاق دیدی تھی یہ سب حضرات جب دمشق گئے اور امیرالمؤمنین یزیدؒ سے بیعت کر کے حضرت حسینؓ کے آخری موقف کی تکمیل کر دی تو اس بیعت پر ہمیشہ قائم رہے، امیرالمؤمنین کے خلاف کسی تحریک میں حصہ نہیں لیا۔ بلکہ انکی وفات کے بعد بھی ان کے وفادار رہے اور ابن الزبیرؓ سے بیعت نہیں کی۔

— امیرالمؤمنین یزیدؒ حضرت عبداللہ بن جعفرؓ کے داماد تھے یعنی انکی دختر نیک اختر سیدہ ام محمد کے خاوند سیدہ زینب جو حادثہ کربلا کے سبب بہت ملول تھیں جب اس پیرانہ سالی میں کہ عمر باون برس تھی دمشق گئیں تو اپنے عظیم المرتبت داماد کے حسن سلوک اور با ادب ملاطفت و مدارات سے اتنی متاثر ہوئیں کہ مدینہ طیبہ میں واپس ہونے کے بجائے وہیں رہ گئیں تا آنکہ وہیں وفات پائی۔ دمشق میں ان کا مزار مبارک زیارت گاہِ خلائق ہے۔

لوگوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ سیدہ زینبؓ کے دو نو عمر بچے عون اور محمد کربلا میں شہید ہوئے۔ اس سلسلے میں بہت دلدوز افسانے اور مرثیے پڑھے جاتے ہیں، حالانکہ یہ عون اور محمد سیدہ زینبؓ کے دیور تھے ان میں عون الاکبر، حضرت علیؓ کے سگے بھتیجے ہونے کے علاوہ آپ کے داماد بھی تھے، سیدہ ام کلثوم بنت علیؓ کے خاوند۔ انکی شہادت کے بعد سیدہ ام کلثوم کا نکاح ان کے ایک بھائی حضرت محمد جعفری کے ساتھ ہوا جنھوں نے حضرت حسینؓ کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ انکی وفات کے بعد وہ عبداللہ بن جعفرؓ کے نکاح میں آئیں۔ کیونکہ وہ انکی بڑی ہمشیرہ سیدہ زینب کو طلاق دے چکے تھے۔ سیدہ زینب کے ایک ہی فرزند تھے جناب علی جو الزینبی کہلاتے ہیں وہ اپنے والد ماجد کے حکم سے اپنی والدہ اور اپنے ماموں کا ساتھ دینے سے رکے رہے۔ کربلائی سفر میں ساتھ نہ گئے۔

کس قدر تعجب کی بات ہے کہ عون اور محمد کو حضرت عبداللہ بن جعفر کی بجائے اور حضرت حسینؓ کے چچا کے فرزندوں کی حیثیت سے نہیں رو یا جاتا بلکہ کذباً وافتراً سیدہ زینب کے کم سن فرزند بنا کر رو دیا جاتا ہے ۔ گو یا حضرت جعفر طیارؓ کے فرزند اس قابل نہیں کہ حضرت حسینؓ کے ساتھ شہید ہونے کے باوجود ان کا ماتم کیا جائے ۔ اسی طرح خود حضرت حسینؓ کے بھی دو بھائیوں کا نام کسی کی زبان پر نہیں آتا حالانکہ وہ بھی کربلاء میں شہید ہوئے تھے یعنی ابو بکر اور عثمان فرزندان حضرت علیؓ کا اس طرح تخریبی مقاصد کے تحت علم الانساب غارت کیا جاتا ہے

بعض لوگ شبہ کرتے ہیں کہ دمشق میں جن ، سیدہ زینب کا مزار ہے وہ بنت علی کہلاتی ہیں وہ ہیں تو بنتِ علی ہی مگر بنت الحسن بن علی بن ابی طالب کی حیثیت سے جو امیر المؤمنین الولید الاوّل کی زوجہ محترمہ تھیں ، اگر یہ ثابت ہو جائے تب بھی ، یہ اسکی دلیل ہے کہ حادثہ کربلاء کا کوئی اثر آل علی نے لیا نہیں لیا جو انھیں اموی سادات سے برگشتہ کر دے بلکہ انھوں نے باہمی محبت ومودت برقرار رکھی ۔ کیا اس کا یہ قطعی ثبوت نہیں کہ بنو ہاشم نے حادثہ کربلا کی ذمہ داری امیر المؤمنین یزیدؒ اور ان کی حکومت پر نہیں ڈالی ۔ یہ حسن بن الحسنؒ حادثہ کربلاء میں موجود تھے ۔ جیسا کہ مذکور ہوا ۔ اور وہاں کی ایک ایک بات ان کی آنکھوں دیکھی تھی ۔ لیکن نہ تو یہ امیر المؤمنین یزیدؒ کے خلاف اہل مدینہ کی بغاوت میں شامل ہوئے جو ابن الزبیرؓ کے داعیوں نے بپا کی تھی نہ انھوں نے التوابون اور مختار ثقفی سے کوئی تعلق رکھا جو اپنے تخریبی مقاصد کے تحت یکے بعد دیگرے خون حسینؓ کا بدلہ لینے کھڑے ہوئے تھے ۔ اور نہ انھوں نے بعد میں ابن الزبیرؓ سے بیعت کی ۔ کیونکہ وہ مرکز خلافت دمشق کو جانتے تھے ۔ اور وہاں کے ارباب حل وعقد نے ابن الزبیرؓ کو باغی قرار دیدیا تھا

پھر امیر المؤمنین عبد الملکؒ کی بیعت میں داخل ہو گئے اور اپنی نورِ چشم کو انکے فرزند ارجمند ولید اولؒ کے حبالۂ عقد میں دیدیا۔ جو بعد میں دعوت محمدیہ کے عظیم ترین علمبردار اور امت محمدیہ کے یگانۂ روزگار امام ثابت ہوئے

حضرت حسینؓ کی شہادت سے جن حضرات کے دلوں پر سب سے زیادہ چوٹ پڑی، ان کا طرز عمل تو یہ تھا کہ امیر المؤمنین یزیدؒ کو اپنا امام تسلیم کرنے کے علاوہ اپنا شفیق بزرگ بھی جانتے تھے۔ لیکن ان کی محبت کا دم بھرنے والوں نے امیر المؤمنین کے خلاف وہ طوفان بپا رکھا ہے کہ جو لوگ اپنے آپ کو اہل السنہ کہتے ہیں وہ بھی اکثر اس میں بہہ گئے۔ اس صورت حال کی زیادہ ذمہ داری ان مصنفوں پر ہے جنھوں نے واہی روایتیں اپنی کتابوں میں بھر دیں اور اہل تشیع کی روایات لینے سے احتراز نہ کیا۔ پھر وہ مصنف ہیں جو تھے تو شیعی مگر کہتے تھے اپنے آپ کو اہل تسنن، اور اس طرح انھوں نے کام کیا مثلاً محمد بن جریر طبری جو اپنی تفسیر اور تاریخ کے سبب بڑا مقام رکھتے ہیں۔ اور بعد کے لوگوں نے ان کے علمی تبحر کے سبب علماء اہل سنت میں سمجھ لیا۔ حالانکہ ہمعصر مسلمانوں نے انھیں اس قابل نہیں سمجھا کہ مقابر مسلمین میں انھیں دفن کریں۔ وہ اپنے گھر میں مدفون ہوئے۔

اسی طرح ابو عبد اللہ الحاکم نیشاپوری بڑے محدث تھے اور اکابر علماء و فقہاء سے انھوں نے فیض لیا لیکن تھے شیعی المشرب۔ ان کی کتاب المستدرک اس پر شاہد ہے۔ ایسی ایسی واہی روایات کو انھوں نے اپنے مقاصد کے تحت بخاری و مسلم کی شرط پر صحیح قرار دیا ہے جن کی کچھ اصل نہیں، ویسے ان کی کتاب معرفۃ علوم الحدیث بلند پایہ ہے اور طلباء علم حدیث کیلئے مفید۔ مگر اس میں انھوں نے یہ اہتمام کیا ہے کہ امیر المؤمنین معاویہؓ کا اسم

گرامی نہ آنے پائے - ان کا رفض خلفاء ثلثہ کے بارے میں نہ تھا - کیونکہ ان کے ساتھ انھوں نے بڑی عقیدت ظاہر کی ہے - البتہ اموی خانوادے سے نفرت کے ذریعہ انھوں نے اپنا کام چلایا ہے - حالانکہ اس عہد کے مسلمان اہلِ سنت میں انھیں سمجھتے تھے جو حضرت معاویہ رض کے ساتھ بھی وہی عقیدت رکھیں جو خلفاء ثلثہ کے ساتھ ہو - چنانچہ محمد بن ابی طاہر ان کے بارے میں فرماتے ہیں - (طبقات الشافعیۃ الکبریٰ، ج ۳، ص ۶۸ طبع مصر)

انہ کان شدید التعصب	وہ باطن میں شیعی تعصب رکھتے تھے
فی الباطن وکان یظہر التسنن	اور ظاہر میں حضرت ابو بکر رض اور حضرت
فی التقدیم والخلافۃ وکان	عمر رض کو مقدم رکھتے تھے اور خلافت
منحرفاً غالیاً عن معاویۃ	کی اسی ترتیب کے قائل تھے لیکن
واھل بیتہ یتظاھر بہ	حضرت معاویہ رض اور ان کے گھرانے
ولا یتعتر منہ	سے سخت روگرداں تھے، برملا اس

کا اظہار کرتے اور اس پر انفعال محسوس نہ کرتے -

امام السبکی نے ان کی طرف سے بڑی صفائی پیش کی ہے مگر کامیاب نہیں ہو سکے - کیونکہ انھوں نے دلیل یہ قائم کی ہے کہ جن بزرگوار دل سے الحاکم کو فیض ہے ان کا فیض یافتہ شخص رافضی نہیں ہو سکتا حالانکہ یہ دلیل بہت کمزور ہے دیکھنا تو خود اس شخص کے عمل کا ہے کہ اپنے اساتذہ کے طریقے پر قائم رہا یا اس سے ہٹ گیا - ان کی کتابوں سے ان کا تشیع پوری طرح ظاہر ہے

المسعودی نے بھی اجلۂ و اکابر سے تحصیل علم کی حتیٰ کہ اموی علماء سے بھی، مگر کٹر رافضی تھے - مروج الذھب اس پر گواہ ہے - اس میں اصحابِ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر اس قدر جھوٹ بولے گئے ہیں کہ ان کا شمار نہیں

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں (منہاج السنۃ ج ۲ ص ۱۳۱) وفی تاریخ المسعودی من الاکاذیب مالا یحصیہ الا اللہ تعالیٰ (مسعودی کی تاریخ میں اتنا جھوٹ ہے کہ اس کا شمار بس اللہ تعالیٰ ہی جانے) لیکن سیوطی جیسے لوگ جنھیں تحقیق سے کچھ مس نہ تھا محض حاطب اللیل تھے۔ انھوں نے اہل السنۃ میں ہونے کے باوجود تاریخ الخلفاء میں ایسی لغویات بھر دیں کہ بہت لوگ غلط فہمیوں میں مبتلا ہو گئے۔

ان اکاذیب کے ذریعہ وقائع تاریخی کی صورت مسخ کی گئی ہے اور اکابر امت کے بارے میں ایسی خرافات کو شہرت دی گئی ہے اور ایسے ایسے انداز میں ان اباطیل کو بیان کیا جاتا ہے کہ اہل تسنن بھی ناواقفیت کے سبب غلط راہ پر پڑ جاتے ہیں۔ اس لئے امام اعظم ابوحنیفہؒ نے اہل تشیع کی روایات سے محترز رہنے کا حکم دیا ہے۔ اور اپنا مذہب یہ رکھا ہے کہ جمل و صفین کی طرح حادثۂ کربلا کے بارے میں بھی سکوت کیا جائے اور جن امور میں صحابہ کرام ملوث ہوں ان میں فریق بننے سے گریز کیا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہی حکم ہے۔ اور وحدت امت اسی طرح قائم رہ سکتی ہے۔

دعوت عباسیہ اور آلِ عبد مناف ابوطالب

امیر المومنین معاویہؓ نے صحیح بنیاد پر یہ اہتمام کیا تھا کہ خلافت اسلامیہ کو خالص عربی حکومت رکھیں تاکہ غیر عرب نو مسلم حکومت میں دخیل ہو کر دعوت محمدیہ کو مسخ نہ کر سکیں کیونکہ مجوسی یہودی اور نصرانی لوگوں کو اپنی ثقافت پر بہت غرہ تھا یہ بڑی خطرناک ہوتی اگر انھیں محض اسلام قبول کرنے کے سبب حکومت میں

شریک کر لیا جاتا۔ اسی حکمت عملی کا یہ نتیجہ نکلا کہ مملکت اسلامیہ مستحکم رہی اور دین مبین اپنی خالص شکل میں محفوظ رہا۔ لیکن ساٹھ ستر برس کی مدت میں نو مسلموں کے دلوں میں یہ جذبہ رہ رہ کر ابھرتا تھا کہ دوسرے درجے کے شہری ہونے کی بجائے انھیں بھی حاکمانہ اقتدار میسر آئے۔ آخر عہد اموی میں یہ صورت حال شدت اختیار کر گئی اور وقت آ گیا تھا کہ اب حکمت عملی میں تبدیلی لائی جائے۔

قبیلہ قریش میں سے بنو امیہ کے بعد یہ درجہ بنو ہاشم کا تھا کہ قیادت کے لئے آگے بڑھیں۔ بنو ہاشم میں سے آل علی کی سب تدبیریں پہلے ہی کئی بار ناکام ہو چکی تھیں اور جو گروہ اپنے آپ کو ان کا حامی کہتا تھا اس کا کردار ایسا رہا کہ علویہ کی جانیں تو ضائع ہوئیں مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ پھر ایک بات یہ تھی کہ آل علی کے سامنے سوائے حصولِ حکومت کے اور کوئی عمرانی منصوبہ نہ تھا۔ ان کے تمام خروجوں میں کوئی بات ایسی نظر نہیں آتی جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ خلافت و حکومت پر وہ اگر فائز ہو جاتے تو انکا لائحہ عمل کیا ہوتا۔ ان میں جو بھی کھڑا ہوا اس نے صرف نسبی تعلقوں کا سہارا لیا اور کوئی بات ایسی پیش نہ کی جس کے سبب لوگ اس کی حمایت پر کمر بستہ ہو سکیں۔ علویہ کی حمایت میں یا ان کا قصاص لینے کے بہانے جو لوگ کھڑے ہوئے انکا مطمح نظر بھی صرف فساد تھا۔ اسی لئے جمہور صحابہ و آل البیت نے انھیں ملت کا دشمن قرار دیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اقربیت کے دعوے سے کھڑے ہونے والے ایک طرف آل عباسؓ تھے اور دوسری طرف حضرت علیؓ کی فاطمی اولاد آل علی کی ناکامیوں کے سبب آل عباس نے اپنی تحریک ان سے الگ رکھی حالات حاضرہ کے تحت اب ذمہ داری بھی انہی کی تھی کہ امت کی سربراہی اور دعوت

دعوت محمدیہ کی حفاظت و آبیاری کا انداز ایسا رکھیں کہ وحدت امت پیدا ہو۔
یوں یہ عظیم الشان دعوت شروع کی گئی جس نے اسلام کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ
کا دھارا موڑ دیا۔ اور وہ نظام بروئے کار آیا جسے چلانے کے لئے تمام کلمہ گو
صدیوں تک برابر کے حصہ دار بنے رہے۔ سب اہل تاریخ متفق ہیں کہ اس
عجیب و غریب اور کامیاب ترین دعوت کا اجرا ۱۰۰ھ میں ہوا اور یہ زمانہ
امیر المؤمنین عمر ثانی اموی کا تھا۔

حبر الامۃ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پوتے حضرت محمد الامام عباسیؒ نے
اپنے داعیوں کو حکم دیدیا تھا کہ حجاز اور عراق میں کام نہ کریں بلکہ ابتدار خراسان
سے کی جائے۔ حجاز میں تحریک کی ضرورت نہ تھی اور عراق میں کام شروع کرنے
کا مطلب ہوتا کہ چھوٹتے ہی دعوت کو تعمیری رکھنے کی بجائے تخریبی بنا دیا
جائے۔ چنانچہ عباسی داعیوں نے شرق و غرب میں ہر زاویہ نگاہ سے محنت
کر کے رائے عامہ اپنے حق میں استوار کی۔ جو لوگ ہموار ہو جاتے ان سے بیعت
لیجاتی تھی کہ امام کے ظہور پر ان کا ساتھ دیں گے۔ یعنی اس بات کا اہتمام تھا کہ
خلیفۂ وقت کی بیعت توڑنے اور ان کی اطاعت سے منہ موڑنے کی ترغیب
نہیں دی جاتی تھی۔ بیعت آیندہ کے لئے لی جاتی تھی اور اس طرح قواعد شرعیہ
کا پورا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ خراسان میں کام مکمل کرنے کے بعد سب سے آخر
میں عراق پر توجہ کی گئی۔ امام اعظم اور امیر ہبیرہ کے عنوان کے تحت صورت
حال بیان کی جا چکی ہے، اس وقت حال یہ تھا کہ چاروں طرف عرب قبائل
خصوصاً مضری و یمنی عرب آپس میں ایسے دست و گریباں تھے جیسے انکا
کوئی سربراہ ہی نہ ہو۔ ہر طرف شورش اور خون خرابہ تھا، ان فتنوں میں عباسی
داعیوں نے کوئی حصہ نہیں لیا۔ اور نہ انھوں نے خلافت قائمہ کے خلاف

کوئی علانیہ حرکت کی، البتہ امت کی اس خانہ جنگی سے انھوں نے فائدہ خوب اٹھایا
ہر جگہ اپنے ہمنوا پیدا کئے ۔ اور سب پر ثابت کر دیا کہ اختلال کی یہ صورت اسوقت
رفع ہو گی جب آل بیت نبوت میں سے بنو العباس کے ہاتھ میں زمام کار آئے گی
کیونکہ ہمارے امام کی دعوت کی بنیاد ہی یہ ہے کہ خلافت اسلامیہ کو عربی رکھنے
کے بجائے تمام مسلمانوں کو اس میں نمایندگی دیجائے اور ہر علاقے کے مسلمانوں
کو اندرونی آزادی و خود مختاری حاصل ہو۔

اس حسن سے تعمیری انداز میں یہ تحریک چلائی گئی اور کامیابی سے ہم کنار
ہوئی ۔ صحیح ہے کہ داعیوں نے اپنے مقاصد کے تحت جوڑ توڑ سے بھی کام لیا۔
لیکن یہ انتشار کو ہوا دینے کے لئے نہ تھا بلکہ غرض یہ تھی کہ اسی انتشار کو وجہ
ائتلاف بنایا جائے ۔ لوگوں نے پروپیگنڈا کیا ہے کہ اہل خراسان کی فوجی
طاقت کے ذریعہ عباسیوں نے ملت اسلامیہ پر اپنا تسلط قائم کیا اور بزور
شمشیر حکومت پر قابض ہو گئے ۔ گویا ان کے نزدیک خراسانی لوگ اتنے
ہیبت ناک تھے اور ایسے ایسے تباہ کن آلات حرب کے مالک کہ پورے
عالم اسلام کو انھوں نے زیر کر لیا ۔ اور وہ بھی دوسری صدی کے مسلمانوں
کو جن میں سے ہر بالغ شخص ہتھیار بند تھا اور ماہر حرب و ضرب ۔

اگر ان پروپیگنڈا کرنے والوں میں تھوڑی سی بھی بے تعصبی ہوتی اور
امت مسلمہ کی روح کا انھیں ادراک ہوتا، جو جبر کے سامنے آج بھی نہیں
جھکتی، تو ایسی بات نہ کہتے عباسیوں کا تسلط اس لئے قائم ہوا کہ احوال حاضرہ
سے امت نالاں تھی ۔ اور چاہتی تھی کہ فتنہ و فسادرفع ہو کر یکجہتی آئے
کیونکہ اموی حکمت عملی اب اپنی افادیت کھو چکی تھی ۔ اور ہر جگہ کے لوگ
حکومت میں برابر کا حصہ چاہتے تھے ۔ اس طرح انقلاب کے لئے فضا،

ہموار تھی اور قدرتی بات تھی کہ لوگوں کی نگاہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کی طرف اٹھیں۔ آل علیؓ کے عقیم اور بے نتیجہ اقدامات کے مقابلے میں صرف آل عباسؓ تھے، جن کا پیغام تعمیری تھا اور جن کی تحریک میں آزادی اور مساوات کی بشارت تھی۔ چنانچہ ہر جگہ کے مسلمان ان کی طرف جھکتے گئے، اور انہی کو امت کا نجات دہندہ سمجھا۔

عباسی امام نے ظہور اس وقت فرمایا۔ جب فضا انقلاب کیلئے تیار ہوگئی، امت کا کوئی متفق علیہ امام نہ رہا اور خود اموی خاندان میں پھوٹ پڑ گئی۔ یوں تو زوال کے آثار امیر المومنین ہشامؒ کی آنکھ بند ہوتے ہی نمودار ہو گئے تھے۔ ایسے ہی جیسے اورنگ زیبؒ عالمگیر کی وفات کے بعد ہند میں ہوا۔ لیکن غضب یہ ہوا کہ آخری متفق علیہ خلیفہ ولید ثانیؒ کو ۱۲۶ھ میں افترا و کذبا بدترین الزامات لگا کر شہید کر دیا گیا۔ اور یوں اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی چلا کر اس گھرانے نے طوائف الملوکی کی صورت پیدا کر دی۔ اس ہنگامے کے بعد جناب مروان ثانیؒ نے خاندانی اختلال پر قابو پا کر معاملات سلجھانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اپنی انسانی فضیلتوں مومن خصلتوں اور قائدانہ صلاحیتوں کے باوجود وہ نہ ایسی مقبولیت حاصل کر سکے اور نہ اتنی مادی طاقت کہ ملت کا اختلال دور کر سکیں اور مرکزیت پیدا ہو جائے۔ حالات ان کے قابو سے باہر ہو چکے تھے۔ انکی بیعت ۱۲۷ھ میں ہوئی مگر اس سے پہلے ہی عباسی داعی میدان عمل میں کھل کر سامنے آ چکے تھے اور اسی سال خراسان میں عباسی امام کی بیعت کی تکمیل ہو چکی تھی اور جنگوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ یعنی مروان ثانی کی آئینی حیثیت اتفاقی تسلیم نہ تھی کیونکہ اس کا انعقاد عباسی امام کی بیعت کے بعد اور اختلافی ماحول

میں کیا گیا تھا۔ عالم یہ تھا کہ دمشق کے قرب جوار کے علاوہ امویوں کا اقتدار جاتا رہا تھا اور کامیابی کے وسائل کم سے کم تر ہوتے چلے جا رہے تھے۔

اس صورت حال سے پریشان ہو کر اور عباسی داعیوں کی روز افزوں کامیابیاں دیکھ کر امویوں کے ایک طرفدار علوان بن المقنی نے وہ مشہور اشعار مروان ثانی کو لکھ بھیجے جن سے اموی موقف کی کمزوری اور ان کی سیاسی زبوں حالی عیاں ہے۔ ان کے اس مخلص کو اس صورت حال کا کوئی مداوا نظر نہیں آتا تھا۔ سوائے اس کے کہ انجام کی پروا کئے بغیر مردوں کی طرح جان کی بازی لگا دی جائے (طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۵، ص ۱۱۱ طبع مصر) اس منظوم خط میں وہ کہتے ہیں۔

فَقُلْ لِبَنِی اُمَیَّۃَ لَیْتَ شِعْرِیْ ... أأَیْقَاظٌ اُمَیَّۃُ اَمْ نِیَامٌ

بنو امیہ سے کہدو کاش مجھے معلوم ہوتا کہ اموی خاندان جاگ رہا ہے یا محو خواب ہے۔

وقد ظھر الخراسانی معہ ... بنو العباس والجیش اللھام

خراسانی ظاہر ہو گیا ہے اور اس کی پشت پر بنو عباس ہیں اور عظیم الشان لشکر

فَاِنْ لَمْ تجمعوا جیشاً یضیق الـ ... ـعراقَ علیھم والشام

اگر تم لوگ اتنا لشکر جمع نہ کر سکو جو عراق اور شام کی سرزمین ان پر تنگ کر سکے۔

فلاقوھم کما لاقی علیاً ... بصفین معاویۃ الھمام

تو ان سے اسی طرح بھڑ جاؤ جیسے اوسائل کی کمی کے باوجود عظیم المرتبت معاویہ حضرت علی سے متصادم ہو گئے تھے۔

وکان علی اقوی منہ عزماً ... وَاَعْلٰی رُتْبَۃً وَھُوَ الْاِمَامُ

حالانکہ حضرت علی اپنے عزائم میں ان سے زیادہ قوی تھے ان کا رتبہ بلند تھا اور وہ خلیفہ تھے۔

وَلَا یَاْخُذْ کُمْ حَذَرٌ وَخَوْفٌ   فَمَا یُغْنِیْ اِذَا حَامَ الْحِمَامُ

اور تم پر ڈر اور خوف مستولی نہ ہو۔ جب میدان کارزار گرم ہو جائے تو پھر پرہیز کا ہے کی۔

پھر کہتا ہے

فَمُوْتُوْا فِیْ ظُهُوْرِ الْخَیْلِ صَبْرًا   کَمَا قَدْ مَاتَ قَبْلَکُمُ الْکِرَامُ

تو گھوڑوں کی پیٹھوں پر اسی طرح استقلال سے جان دو جیسے تم سے پہلے غیرتمند لوگ جان دے چکے ہیں۔

وَلَا تَتَدَرَّعُوْا اَثْوَابَ ذُلٍّ   وَعَارٍ قَدْ تَدَرَّعَهَا اللِّئَامُ

ذلت اور عار کا لبادہ مت اوڑھو۔ کیونکہ یہ لبادہ تو پست فطرت دو ہمت لوگ اوڑھا کرتے ہیں۔

ان اشعار سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اموی خلافت کے احوال دگرگوں ہو چکے تھے اور وقت آگیا تھا کہ انجام سے بے پرواہ ہو کر وہ ذلت کی زندگی پر عزت کی موت کو ترجیح دیں اور ان اشعار سے یہ بھی عیاں ہے کہ جس حزم و عزم کے ساتھ دعوت عباسیہ جاری کی گئی اور اسے قبولیت عام حاصل ہوئی اس کا یہ انجام ہونا تھا کہ فتح سے ہم کنار ہوں اور اموی خلافت کا تختہ الٹ جائے۔

جناب مروان ثانی نے ان اشعار کے جواب میں لکھا تھا الحاضر یری مالا یری الغائب (جو حاضر ہو وہ ان باتوں کو دیکھتا ہے جسے غائب نہیں دیکھ سکتا) یعنی تمہیں کیا معلوم ہے کن مشکلوں میں پھنسا ہوا ہوں) یعنی ایسے مایوس کن حالات سے دوچار تھے۔

افترا دعوت عباسیہ کے سلسلے میں ایک خود ساختہ تصور کو طرح طرح پھیلایا گیا ہے کہ عباسیوں کی تحریک بنو امیہ کی خلاف تھی۔

ور مقصد یہ تھا کہ ان علویوں کے خون کا بدلہ لیا جائے جو اموی عہد میں اپنے خروجوں کے سلسلے میں مقتول ہوئے تھے۔ اسی لئے عباسیوں نے سیاہ ماتمی لباس اختیار کیا اور جھنڈا بھی اپنا سیاہ رکھا۔ بعض افسانہ نگاروں نے یہاں تک کہہ دیا کہ دراصل یہ تحریک علویہ کی تھی اور ان کی ہمدردی میں عباسی لوگ اس میں شامل ہو گئے تھے۔ لیکن جب کامیابی حاصل ہو گئی تو خلافت علویوں کے سپرد کرنے کی بجائے خود اس پر قابض ہو گئے۔ یہ تصویر وہی ہے جو شکست خوردہ لے تدبیر نامقبول لوگوں کا ہوا کرتا ہے۔

عباسیوں کو علوی مقتولوں کا بدلہ لینے کی کیا ضرورت تھی جب کہ یہ خروج ور اقدامات ان کی رائے کے خلاف کئے گئے تھے اور قواعد دینیہ کے تحت انکی کوئی گنجائش نہ تھی، پھر دیکھنا ہے کہ حضرت حسینؓ کے خون کا بدلہ لینے اوّل التوابون کھڑے ہوئے اور پھر مختار ثقفی۔ لیکن بنو ہاشم نے ان دونوں فتنوں سے کوئی تعلق نہ رکھا بلکہ سخت بیزاری ظاہر کی۔ بنو ہاشم تو اس زمانہ میں بنو امیہ کی خلافت کے ایسے حامی تھے کہ انھوں نے ابن الزبیرؓ سے بھی بیعت نہیں کی اور منتظر رہے کہ امیر المومنین عبد الملکؒ کامیاب ہوں تو ان سے بیعت کی جائے۔ کیونکہ امت کا اختلال رفع کر کے مرکزیت پیدا کرنے کی قابلیت اسی یگانہ روزگار بطل جلیل میں تھی اور آئینی حیثیت سے موقف بھی انہی کا صحیح تھا۔ کیونکہ خلافت میں ارباب حل وعقد کے عام اجتماع میں مروانی خلافت پر اجماع ہوا تھا۔ برخلاف اس کے ابن الزبیرؓ کا موقف کمزور تھا۔ بنو ہاشم اور اکابر صحابہ ان کے ادعائے خلافت کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اس لئے کہ انھوں نے متفق علیہ امام امیر المومنین یزیدؒ سے بیعت نہیں کی تھی اور صحابہ کرام کی اجماعی فیصلے کی بے وقعتی کر کے اختلال پیدا کر رکھا تھا۔ انھیں جو تھوڑی سی وقتی

کامیابی نصیب ہوئی تو محض اس لئے کہ کھل کر اپنی خلافت کا اعلان انھوں نے امیر المؤمنین یزیدؒ کی وفات کے بعد کیا تھا، اسی لئے بعض صغار صحابہ ان کے ساتھ ہوگئے تھے۔ مگر ان کا زمانہ کہلاتا ہے "فتنوں کا زمانہ" صحاح میں جہاں کہیں اس دور کا ذکر ہے تو "فتنہ ابن الزبیرؓ" ہی کی حیثیت سے ہے۔

صحیح بخاری میں ابن الزبیرؓ اور امیر المؤمنین عبد الملکؒ کے بارے میں حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول موجود ہے۔ جیسا کہ بیان ہوا (ج ۳ کتاب التفسیر، باب قولہ ثانی اثنین اذ ہما فی الغار ص ۱۲۶ طبع مصر)

ان ابن ابی العاص برز یمشی القدمیہ یعنی عبد الملک بن مروان وانہ لوی ذنبہ یعنی ابن الزبیر (ابو العاص کے فرزند مردانہ وار بڑھ رہے ہیں یعنی عبد الملک بن مروان، اور یہ جو صاحب ہیں تو انھوں نے اپنی دم سکیڑ رکھی ہے یعنی ابن الزبیر) اگر ابن الزبیر کو بنو ہاشم اور اکابر صحابہ کی حمایت حاصل ہوتی اور ان کی خلافت کی آئینی حیثیت تسلیم کرلی گئی ہوتی۔ تو پھر اہل شام کی کامیابی کا امکان نہ تھا۔ اور وہ باغی اور خارجی قرار پاتے۔

رہا زید بن علی بن الحسین کا خروج تو اس کا بھی یہی حال تھا کہ ہاشمی گھر کے کسی ایک فرد نے بھی ان کا ساتھ نہیں دیا، بلکہ ہر طرح کوشش کی کہ سبائیوں کے بہکائے میں آکر متفق علیہ امام کی بیعت توڑنے سے احتراز کریں پھر ان کا بدلہ لینے کا تصور عباسیوں کے ہاں کیوں پیدا ہوتا اور وہ اپنی عوامی تحریک کو خاندانی چپقلش بنا ڈالنے کی غلطی کیوں کرتے۔

عباسیوں کی تحریک خاندان بنو امیہ کے خلاف نہیں تھی بلکہ ان کے سیاسی نظام کے خلاف ایک عوامی تحریک تھی اور اس کا علویہ سے کچھ

لق نہ تھا بلکہ یہ اہتمام رکھا گیا تھا کہ جو لوگ علویہ کے حمایتی کہلاتے تھے انھیں
س تحریک سے دور رکھا جائے۔ یہ تحریک اس غرض سے چلائی گئی تھی کہ خلافت
عربی رکھنے اور غیر عرب مسلمانوں کو اس سے دور رکھنے کے سبب عوام میں بے چینی
ڑھ رہی تھی۔ امویوں کی جگہ اگر اس وقت کوئی اور خاندان ہوتا تب بھی
تحریک اسی طرح چلائی جاتی۔ کیونکہ امت کے احوال ایک عظیم الشان
نقلاب کے متقاضی تھے۔ اور ضروری ہو گیا تھا کہ عباسی امام کے حق میں
ئے عامہ استوار کی جائے، اسباب فراہم کئے جائیں اور موزوں وقت پر
قدام کیا جائے کہ کامیابی متوقع ہو۔

سیاہ رنگ

عربوں میں نہ پہلے سیاہ رنگ کو ماتمی کبھی سمجھا جاتا تھا اور نہ آج سمجھا جاتا ہے۔ اس رنگ کے ماتمی ہونے کا تصوّر
ئی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دو جھنڈے تھے ایک سیاہ جو ظل کہلاتا تھا
سایہ) اور ایک سفید جسے سحاب کہتے تھے (بادل) اموی خلافت میں سفید
نگ اختیار کیا گیا اور عباسی خلافت میں سیاہ۔ اور یہ دونوں رنگ اتباع
نت میں اختیار کئے گئے تھے۔ سیاہ رنگ کو ترجیح دینے کا ایک تاریخی پس
منظر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فاتحانہ شان کی تکمیل فتح مکہ سے ہوئی
ور اس وقت سیاہ عمامہ آپ زیب سر کئے ہوئے تھے۔ پھر غزوۂ تبوک تھا
س کی اہمیت قرآن مجید سے ثابت ہے۔ اس غزوے نے اہل ایمان کا ایمان
ور اہلِ نفاق کا نفاق ظاہر کر دیا۔ اس مہم کی قیادت خود سرورِ کائنات صلی
اللہ علیہ وسلم نے کی تھی۔ اس غزوے میں آپ کا جھنڈا سیاہ تھا اور آپکے
علمبردار تھے حضرت صدیق اکبرؓ (ابن عساکر، ابن ہشام، طبقات ابن سعد،
پھر الاصابہ فی تمییز الصحابہ میں ہے۔ (ج ۲ بذیل سعد بن مالک)

کہ حضرت سعد بن مالک ابو الکنودؓ کو آپ نے جو جھنڈا عطا فرمایا تھا وہ سیاہ تھا اور
اس پر سفید ہلال کا نقش تھا۔ (رایۃ سوداء فیہا ہلال ابیض)
غرض یہ ہے کہ عجمی توجیہات بے اصل ہیں۔ ماتم داری کیا کرتے ہیں شکست
خوردہ ناکام لوگ۔ کامیاب و کامران اصحاب عزیمت کو ماتم داری سے کیا
واسطہ۔ وہ اگر وقتی طور پر ناکام ہو جائیں تب بھی ان کے ہاں رونا پیٹنا نہیں
ہوتا بلکہ نئے عزم اور نئے ولولے سے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ رسم تو چوتھی صدی
ہجری میں مجوسی الاصل بویہی خاندان کے معز الدولہ نے اسوقت جاری کی
جب وہ اور اس کے اہل خاندان امور خلافت پر مستولی ہو گئے۔ اور طاقت
کے بل پر زندقہ و الحاد کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ سبائیوں نے اموی
عباسی خلافت کے سرکاری رنگ سفید و سیاہ کے مقابلے میں سبز رنگ لعلہ
ہی اختیار کر لیا تھا جو مجوسی معبد کے جھنڈے کا رنگ تھا۔

اموی سادات

انقلاب حکومت کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ خلافت عباسیہ
میں اموی سادات کے ساتھ عموماً اور خانوادۂ خلافت
امویہ کے ساتھ خصوصاً عباسی خلفاء کا برتاؤ اس صلہ رحمی پر مبنی تھا جس کے
وہ حقدار تھے۔ تاریخ میں ان بیسیوں اموی بزرگوں کے اسماء گرامی محفوظ
ہیں۔ جنہیں خلافت کے اہم مناصب پر فائز کیا گیا اور انھیں خلفاء عباسیہ
کے ہاں وہی برادرانہ تقرب حاصل تھا جو جاہلیت اور اسلام میں بنو ہاشم اور
بنو امیہ میں ہمیشہ قائم رہا۔ یہ موضوع بہت طویل ہے۔ مختصراً چند حضرات
کے اسماء گرامی یہاں درج کئے جاتے ہیں۔ اور اس سے اندازہ لگے گا کہ عباسی
کی تحریک کسی خاندانی یا نسلی عصبیت جذبے کے تحت نہ تھی بلکہ ملت کی خیر خواہی
اور امت کے ارتقاء کے لئے اسے جاری کیا گیا تھا۔ چنانچہ خلافت قائم ہونے

کے بعد اس دعوت کی آبیاری میں ان تمام حضرات کو شریک کیا گیا جو اس کے اہل تھے اور ملّی فرائض کا انھیں احساس تھا۔ جو لوگ دعوت محمدیہ کے علمبردار ہوتے ہیں انکے ہاں نسلی، لسانی، ملکی اور ایسے ہی دوسرے زمینی امتیازات کی گنجائش کہاں ہوتی ہے۔

اب ملاحظہ ہوں اموی خانوادۂ خلافت اور دوسرے اموی سادات کے اسمارِ گرامی اور عباسی خلفار کے ساتھ ان کے تعلقات خصوصی۔

۱۔ عبد العزیز بن امیر المؤمنین عمر بن عبد العزیز۔ یہ اموی بزرگ، آخری اموی خلیفہ جناب مروان ثانی ؒ کے عہد میں والی مدینہ تھے۔ امیر المؤمنین المنصورؒ نے انھیں اپنا ندیم بنالیا۔ چنانچہ وہ ان کے مخصوص لوگوں میں سے تھے، سیاہ سرکاری لباس پہنتے وکان فی صحابۃ ابی جعفر المنصور خاصًا بہ ممن یلبس السواد و یلازمہ حیث کان (ابن حزم جمہرۃ الانساب صفحہ ۹۷)

۲۔ انہی مروان ثانی ؒ کی صاحبزادیاں اور اعزہ مصر میں تھے ان کی شہادت کے بعد انھیں سب کو عزت و احترام کے ساتھ ان کے وطن حران بھجوا دیا گیا اور ان کے لئے پنشن قرار و وظیفہ مقرر کر دیا۔ امیر المؤمنین المہدیؒ نے اس وظیفے میں اور اضافہ کردیا۔ (ہسٹری آف سیرینز ص ۱۸۳) مطبوعہ ۱۹۴۹ء

۳۔ اموی سادات کے جو خاندان کوفہ اور بصرے میں آباد تھے ان کے ساتھ امیر المؤمنین ابو جعفر المنصورؒ نے رشتہ مناکحت استوار کیا، آپ کی یہ اموی زوجہ محترمہ خالد بن اسید بن ابی العیص بن امیہ کے اخلاف میں سے تھیں ان سے آپ کے دو فرزند پیدا ہوئے علی و عباس اور ایک دختر عالیہ دوسری اموی خاتون سے اپنے فرزند حمید امیر جعفر کا نکاح کیا۔ جو سیدہ زبیدہ

کے والد ماجد ہیں۔ پھر اپنے دوسرے فرزند اور ولی عہد امیر محمد المہدیؒ کا نکاح سیدہ رقیہ بنت عمرو بن خالد بن عبداللہ بن عمرو بن امیر المؤمنین عثمانؓ سے کیا اور ان سے ان کے دو فرزند پیدا ہوئے۔ ایسے ہی اور بھی رشتے قائم کئے

۴۔ حضرت یحییٰ بن سعید بن ابان ابن سعید بن العاص اموی جو بلند پایہ محدث تھے اور کوفے کے ساکن، انھیں اپنے پاس بغداد بلالیا۔ اور اپنی صحبت کا شرف عطا فرمایا۔

۵۔ عبداللہ بن عاصم بن امیر المؤمنین عمر بن عبدالعزیزؒ کو امیر المؤمنین محمد المہدیؒ نے مسجد نبوی کی توسیع کا متولی بنایا۔ امیر جعفر بن سلیمان عباسی اس وقت والی مدینہ تھے (فتوح البلدان ج ۱ ص ۲۷ ترجمہ)

۶۔ آل امیر المؤمنین عبدالملکؒ۔ طبری اور ابن خلدون وغیرہما نے تصریح کی ہے کہ امیر المؤمنین المہدیؒ کا گزر امیر مسلمہ بن امیر المؤمنین عبدالملکؒ کے قصر پہ ہوا، تو ان کے عم بزرگوار عباس بن علی السجادؒ نے بتایا کہ جب حضرت محمد الامامؒ اس طرف آئے تھے تو امیر مسلمہؒ نے ان کی ضیافت کی تھی اور چار ہزار دینار نذر کئے تھے۔ امیر المؤمنین نے حضرت مسلمہؒ کے فرزندوں کو طلب فرما کر بیس ہزار دینار مرحمت فرمائے اور ان کا بیش قرار وظیفہ مقرر کیا۔ ان کی نسل کے لوگ بنی مسلمہ سے معروف ہیں اور ان کے بعض عامل آثار خاندان مصر کے علاقہ "الاشمونین" میں آباد ہیں۔ (الاعلام زرکلی ج ۸ ص ۱۲۲)

۷۔ طبری اور ابن خلدون نے بتایا ہے کہ ۱۴۵ھ میں حبشیوں نے مدینہ طیبہ میں لوٹ مار کی اور فساد کیا تو اس وقت مسجد نبوی میں نماز پڑھانے کے لئے ایک اموی نوجوان بلند آواز سے یہ کہتے ہوئے امامت کے لئے بڑھے میں الاصبغ بن سفیان بن عاصم بن عبدالعزیز بن مروان ہوں اور امیر المؤمنین ابو جعفر کی

طاعت کے ساتھ تم کو نماز پڑھاتا ہوں (طبری ج ۳ ص ۲۵۳)

۸۔ علی بن عبداللہ بن خالد بن یزید بن حضرت معاویہؓ جو السفیانی کہلاتے تھے اور مادری نسب میں عباس بن علیؓ بن ابی طالب کے نواسے تھے دمشق میں مسکن گزین تھے۔ خلیفہ مامون الرشیدؒ کے عہد میں علم بغاوت بلند کیا اور ۱۹۵ھ میں مارے گئے (الاعلام زرکلی ج ۵ ص ۱۱۷ و دیگر کتب)

(۹) ابومروان محمد بن عثمان اموی۔ آپ امیر المؤمنین المعتصم باللہ اور ان کے فرزند امیر المؤمنین الواثق باللہ کے زمانہ میں مکہ معظمہ کے قاضی تھے جمہرۃ الانساب ص ۷۸۔

۱۰۔ بغداد کا عدلیہ اور اموی قضاۃ۔ امیر المؤمنین جعفر المتوکل علی اللہ کے عہد سے لے کر ڈھائی سو برس تک بغداد کے عدلیہ پر اموی سادات فائز رہے۔ امام ابن حزمؒ فرماتے ہیں (جمہرۃ الانساب ص ۱۰۵)

القضاء فی بغداد مترددٌ فی بنی ابی عثمان بن عبد اللہ بن خالد بن اُسید بن ابی العیص بن امیۃ من عہد المتوکل الی زماننا ھذا وھم بنو ابی الشوارب۔	بغداد میں عہدۂ قضاء (امیر المؤمنین) المتوکل علی اللہ کے عہد سے ہمارے زمانے تک ابی عثمان بن عبداللہ بن خالد ابن اُسید بن ابی العیص بن امیہ کے خاندان میں متوارث چلا آتا ہے یہ لوگ بنو ابی الشوارب کہلاتے ہیں۔

ان میں علی بن محمد بن عبدالملک بن محمد ابی الشوارب اور محمد بن عبداللہ اموی بغداد کے قاضی القضاۃ تھے۔ اسی طرح العاص بن محمد اموی بصرے کے قاضی تھے۔ علامہ ابن کثیر نے ۳۱۱ھ کے واقعات میں ابوالحسن احمد بن محمد بن عبداللہ بن عباس بن محمد بن عبدالملک بن محمد ابی الشوارب القرشی الاموی کو

قاضی القضاۃ بتایا ہے۔ بغداد میں وفات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ
بڑے فاضل و زاہد تھے بارہ برس قاضی القضاۃ رہے۔ بصرے میں دوسرا
اموی خاندان حضرت ابو سفیانؓ کے فرزند عتبہ کی اولاد میں تھا۔ ان میں مشہور
ادیب و مصنف محمد بن عبداللہ بن عمرو ابو عبدالرحمٰن اموی العتبی تھے (م ۲۲۸ھ)
ان کے جد اعلیٰ امیر المؤمنین حضرت معاویہؓ کے بھائی عتبہ کی نسل میں ایک مشہور
عالم و مصنف محمد بن احمد بن محمد بن اسحاق بن الحسین بن المنصور بن معاذ
بن محمد بن عثمان بن عتبہ بن ابو سفیانؓ تھے جو بقول علامہ ابن کثیر لغت و
انساب کے عالم انساب العرب پر ان کی تالیف ہے وہ خراسان کے ابی ور
مقام کے ساکن تھے۔ اس شہر کی تاریخ بھی لکھی ہے۔ المؤتلف والمختلف
پر ان کی کتاب بھی ہے ۵۰۷ھ میں وفات ہوئی (البدایہ ج ۱۲ ص ۱۷۶)
ایسے ہی اور بھی علماء و فضلاء اس دودمان عالیشان کے عراق و شام وغیرہ
آباد تھے۔ مثلاً عبداللہ بن سعید بن عبدالملک بن مروان جن کی کنیت ابو صفوان
تھی۔ امیر المؤمنین عبدالملکؒ کے پوتے ہیں۔ یہ دمشق میں رہتے تھے، کتاب
النوادر کے مصنف ہیں ۱۵۴ھ میں بعہد امیر المؤمنین المنصورؒ وفات پائی

اموی دودمان عالی شان کے بڑے بڑے علماء اور اولیاء اللہ عہدِ عباسی
میں مشہور انام تھے۔ اور ان کے فیوض سے یہ امت بہرہ ور تھی مثلاً ابو الولید
حضرت حسان بن محمد بن احمد بن ہارون بن حسان بن عبداللہ بن عبدالرحمٰن
عنبسہ بن سعید بن العاص القرشی الاموی۔ جو خراسان میں امام اہل حدیث تھے
اور مرجع خلائق۔ ان کی پیدائش کی بشارت ان کی والدہ ماجدہ کو خواب میں
ملی تھی۔ اور خدا تعالیٰ کے یہاں انھیں اتنی مقبولیت حاصل تھی کہ ابو الحسن
عبداللہ بن محمد الفقیہؒ فرماتے ہیں۔ مجھ پر اگر کوئی علمی مشکل پیش آتی یا دنیا

کوئی پریشانی ہوئی تو میں حضرت ابوالولیدؒ کے مزار پر حاضر ہوتا اور ان کے توسل سے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا تو میری مشکل حل ہو جاتی تھی (طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۲، ص ۱۹۱-۱۹۲- طبع مصر) ۲۷۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۴۹ھ میں وفات پائی۔

غرض یہ ہے کہ سیاسی انقلاب میں جتنا کشت و خون ہوتا ہے اس انقلاب میں بھی ہوا۔ لیکن لوگوں نے عجیب غریب بہیمانہ حرکتیں عباسیوں سے منسوب کردی ہیں کہ چن چن کر ایک ایک اموی کو قتل کیا گیا اور خلفاء پیشین کے مزارات کی بے حرمتی کی گئی۔ امیر المؤمنین ہشامؒ کی لاش قبر سے نکال کر سولی پر لٹکائی گئی، اس کے کوڑے مارے گئے اور پھر جلا دیا گیا۔ اسی طرح ستر اسّی اموی سادات کو قتل کرکے ان کی تڑپتی ہوئی لاشوں پر دستر خوان بچھا کر کھانا کھایا دستر خوان کیسے بچھایا اس کا ذکر نہیں۔ یہ حد درجہ مکروہ بے بنیاد روایت سب سے پہلے ابو مخنف جیسے مؤلف نے جسے سب ہی ائمہ رجال نے کذّاب بتایا ہے اپنی کتاب میں درج کی تھی اسی کذّاب راوی سے بعد کے مؤلفین تحقیق کی آنکھ بند کرکے نقل در نقل کرتے رہے ہیں۔

اسی قسم کی ایک لرزہ خیز روایت طبری نے یہ لکھی ہے کہ جب امیر المؤمنین المہدیؒ نے مسند خلافت کو رونق بخشی تو انھوں نے قصر خلافت میں ایک کمرہ دیکھا جو مقفل رہتا تھا۔ انھیں تجسس ہوا کہ اس کمرے میں کیا ہے۔ اسے کھلوایا تو دیکھا کہ بے شمار آدمیوں کی کھوپڑیاں صاف کی ہوئی رکھی ہیں اور ہر ایک پر پرچی لگی ہوئی ہے کہ یہ سر کس کا ہے۔ آپ یہ منظر دیکھ کر لرز گئے اور سب کو دفن کرا دیا۔ یعنی بیٹے کو جو ولی عہد بھی تھا یہ خبر نہ تھی کہ ابّا جان کیا حرکتیں کیا کرتے تھے۔ آخر لوگوں کا قتل ہوتا ان کی کھوپڑیوں سے کھال اتارنا اور صفائی

کرتا۔ پھر کوٹھری میں قرینے سے رکھنا اور نقشیوں کا بیٹھ کر ہر ایک کے نام کی پر
لگانا کہ کہیں غلطی نہ ہو جائے۔ یہ سب کام ایسے چپ چپاتے ہوتا تھا کہ کسی
کانوں کان خبر نہیں ہوتی تھی حتیٰ کہ بیٹوں کو بھی کچھ معلوم نہ تھا۔ لکھنے والوں
یہ لغویات اپنے مقاصد کے تحت لکھیں، لیکن شرم انھیں نہیں آتی جو حوالے
دے کر انھیں بیان کرتے ہیں اور باور کرانا چاہتے ہیں کہ قصر خلافت امیر
گاہ انام نہیں تھا بلکہ بوچڑ خانہ تھا۔ لعنۃ اللہ علی الکاذبین۔
انقلاب کی ایک ایک بات امیر عبدالرحمٰن الداخل اموی کی دیکھی ہوئی
تھی۔ انھوں نے ہسپانیہ جا کر یہ باتیں کیوں نہیں بیان کیں اور وہاں
مصنفوں نے انھیں کیوں نہیں لکھا۔ حالانکہ انھیں خوب نمک مرچ لگا
لکھنا چاہیے تھا۔ یہ سب روایتیں سبائی راویوں کی بیان کردہ اور شیعی مصنفوں
کی اپنی کتابوں میں درج کردہ ہیں جنھیں دوسرے لوگ نقل در نقل کرتے چلے
جاتے ہیں۔ اور عقل کو کام میں نہیں لاتے۔ ہمیں تو یہ ملتا ہے کہ جب حضرت
الداخل ہسپانیہ میں متمکن ہو گئے تو اپنے اہل و عیال کو دمشق سے بلوایا۔ اگر
خانوادۂ خلافت کے ایک ایک شخص کو قتل کر دیا گیا تھا تو یہ لوگ کیسے بچ گئے
جو لوگ مزارات اکھاڑ پھینکنے اور لاشوں پر تازیانے برسانے والے ہوں
مردوں کی ہڈیاں جلوانے والے ہوں۔ اور تڑپتی لاشوں پر
خوان بچھا کر کھانا کھائیں۔ ان کی بہیمانہ حرکتوں کا تقاضا تو یہ تھا کہ تمام
امت ان سے ناراض ہو جائے اور جیسے ایک حکومت کا تختہ الٹا تھا ان کا
بھی الٹ دیتی۔ لیکن ہم دیکھتے یہ ہیں کہ اموی خلافت بھی سو برس تک اتنی
مقبول رہی کہ ان کے مقابلے میں کوئی ہنگامہ کارگر نہ ہو سکا۔ اور عباسی
خلافت بھی تا ٔنداز پانچسو برس بغداد میں اس شان سے قائم رہی کہ جو بھی

خلاف کھڑا ہوا، اس نے منہ کی کھائی۔ پھر یہ بات بھی عجیب ہے کہ اموی خلافت
مشرق میں ختم ہوئی تو مغرب میں قائم ہو گئی اول امارت کی حیثیت سے پھر خلافت
کی صورت میں۔ اسی طرح خلافت عباسیہ بغداد ختم ہوئی تو مصر میں دوبارہ
عباسی خلافت ہی کا احیاء کیا گیا۔ برخلاف اس کے جو افراد ان خلافتوں
کے خلاف کھڑے ہوئے ان کے سب عزائم خاک میں مل گئے، اس تاریخی
حقیقت کی روشنی میں وضعی مناقب و فضائل اور مظلومیت کی داستانیں
کب قابل اعتناء رہتی ہیں۔ اور کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اپنے اپنے وقت میں
اموی اور عباسی خلافتوں کو قبولیت عام حاصل نہ تھی اور لوگ دیوانہ وار
ان ہستیوں پر فدا تھے جو وقتاً فوقتاً خلافت قائمہ کے خلاف کھڑے ہو کر
ناکام رہے۔

علوی سادات

امیر المؤمنین المامون کے زمانہ میں عباسیوں کی مردم
شماری کی گئی تو چھوٹوں، بڑوں، مردوں اور عورتوں
کی تعداد تیس ہزار تین تھی (ضحی الاسلام ج ۱ ص ۱۲۶) اس سے اندازہ لگایا
جا سکتا ہے کہ باقی ہاشمیوں اور مطلبیوں کی تعداد کتنی ہو گی۔ بعد کی صدیوں
میں جو اضافہ ہوا وہ اپنی جگہ ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ اموی اور عباسی
خلافتوں میں ڈھائی سو برس کے اندر حسنیوں اور حسینیوں کے خروجوں کی
تعداد پینسٹھ کے قریب ہے (ملاحظہ ہو تحقیق مزید بسلسلۂ خلافت معاویہ و
یزید) ان میں سے کسی کو اتنی حمایتی میسر نہ آسکے کہ معمولی چپقلش سے زیادہ
امت کو کچھ نقصان پہنچا سکیں۔ پھر ان میں ایک بھی خروج ایسا نہ تھا جس
میں کھڑے ہونے والے کو اس کے اپنے گھرانے کے لوگوں نے غلط اقدام سے
نہ روکا ہو۔ اور اس کا ساتھ دینے سے گریز نہ کیا ہو۔

لہذا یہ سمجھنے کی گنجائش نہیں کہ امویوں اور ہاشمیوں میں یا، عباسیوں اور علویوں میں کوئی خاندانی چپقلش تھی۔ یہ سب آپس میں شیر و شکر تھے اور ان کے باہمی رشتے پیہم و متواتر ہوتے رہے اور آج تک ہوتے ہیں۔ سیاسی خلفشار جو گنے چنے لوگوں نے پیدا کیا تھا اس کا کوئی اثر ہاشمیوں و امویوں کی اپنی مودت اور تعلقات خویشی پر نہیں پڑنے دیا۔ لیکن ہوا پرست لوگوں نے ان ہزاروں علوی سادات کو فراموش کر کے بعض افراد کے شخصی اقدامات کو خاندانی اور نسلی نزاع کی صورت دیدی۔ بلکہ انھیں دینی رنگ دینے سے بھی گریز کیا۔ یہ نہ سوچا کہ امویوں امویوں میں، عباسیوں عباسیوں میں، حسینیوں اور حسینیوں میں، حسینیوں حسینیوں میں بھی سیاسی بنا پر خوں ریزی ہوئی۔ جب ان واقعات کو خاندانی یا دینی نہیں بنایا گیا اور افراد تک محدود رکھا گیا تو ان مینٹھ خروجوں کو یہ اہمیت کیوں دی جائے۔ جو دیدی گئی ہے۔ اور امت میں مستقل افتراق کا سبب بنا دیا گیا ہے جب خود امویوں، عباسیوں اور علویوں نے ان واقعات کو اہمیت نہیں دی اور باہمی مودت و قرابت کے تعلقات کی خوشگواری قائم رکھی، تو بعد کے لوگوں کو کیا حق ہے کہ وہ پرانی باتوں کو ہوا دیتے رہیں اور گڑھے مردے اکھاڑیں۔

امت کے سواد اعظم کا ہمیشہ یہ وتیرہ رہا اور یہی سنت صحابہ کرام کی ہے کہ اگر وقتی اختلاف پیدا ہو حتی کہ جنگ و جدل تک نوبت پہنچ جائے تو وقت گزر جانے پر اختلاف نے سب کچھ بھلا دیا اور وحدت امت قائم رکھی، اسی کے نتیجے میں ارتقاء ہوا اور دنیا میں مسلمانوں کی دھاک بیٹھی ان لوگوں کو ڈیڑھ ہزار برس کے اس تجربے کے باوجود یہ بات کیوں سمجھ میں نہیں آتی کہ گزرے ہوئے حوادث کا ہیجان انگیز تذکرہ تعمیری نہیں ہے۔

تحریبی ہے۔ اخلاف کے قلوب اسلاف کی طرف سے مکدر ہوتے ہیں اور گزرے ہوئے لوگوں کی ہستیاں زیر تنقید آتی ہیں۔ منہ میں زبان اور ہاتھ میں قلم کسی خاص طبقے کے ساتھ مخصوص نہیں اور غلط باتوں کی تنقیح تو اہل فکر کو کرنی ہی پڑتی ہے۔

علویوں کے پیسہ خروج، اور ملت اسلامیہ کے ساتھ چھپا سھڈویں غداری، شریف حسین کی، ایسی حرکتیں نہیں ہیں کہ امت مسلمہ کو ان لوگوں سے کوئی ہمدردی ہوتی اور وہ انھیں خلافت پر فائز کرنے کے لئے کسی درجے میں تیار ہو سکتی۔ یہ وجہ ہے کہ ان لوگوں کو کبھی کامیابی نہ ہو سکی اور ان افراد کی حرکتوں کا نتیجہ سوائے فتنہ و فساد کے اور کچھ نہ نکلا۔ یہ فساد اگر معمولی سیاسی چپقلش کی طرح کے ہوتے تب بھی ایک بات تھی مگر انھوں نے تو اس میں بہیمانہ اور شرمناک بلکہ ناپاک حرکتیں کیں کہ قلوب ان کی طرف سے ہٹتے چلے گئے۔ مثلاً۔

۱۔ حسین بن الافطس بن الحسن بن علی بن الحسین:۔ ان صاحب نے امیر المؤمنین المامون کے عہد میں خروج کیا۔ کعبہ شریف کے ستونوں پر جتنا سونا چڑھا ہوا تھا وہ کھرچ لیا۔ اور کعبہ کے خزانے میں جتنی نفیس اشیاء تھیں انھیں لوٹ لیا۔ لوگوں کا مال و متاع ہتھیانے کے علاوہ ان پر ایسے ایسے مظالم کئے کہ اکثر لوگ شہر چھوڑ کر بھاگ گئے۔ یہ بیان عمدۃ الطالب کے شیعہ مورخ و نسابہ کا ہی ہے۔

۲۔ محمد بن جعفر الصادق:۔ اپنے صادق باپ کا یہ کاذب بیٹا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے جھوٹی حدیثیں بیان کیا کرتا تھا۔ ابن الافطس نے جب دیکھا کہ اس کی حرکتوں سے لوگ انتہائی متنفر ہو گئے ہیں

تو محمد ابن جعفرؒ کو ورغلا کر اس کی خلافت کا اعلان کر دیا۔ لیکن علامہ خلدونؒ لکھتے ہیں۔

بعد چندے محمد بن جعفر (الصادق) کے لڑکے علی اور حسین ابن الافطس نے ہاتھ پاؤں نکالے اور طرح طرح کی بدعمالیاں کرنے لگے۔ زنا، اغلام اور سر بازار عورتوں کو بے عزت کرنا شروع کر دیا اور اتنا کہ حسین عورتوں کو اپنی عصمت بچانی مشکل ہو گئی اور انھوں نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا۔ پھر جہاں کہیں کوئی خوبصورت لڑکا نظر آجاتا۔ اس پر یہ لوگ ٹوٹ پڑتے حتیٰ کہ قاضی مکہ کو بھی نہ چھوڑا۔

امیر المؤمنین المامونؒ نے سرکوبی کے لئے لشکر بھیجا تب اس فتنہ سے نجات ملی۔ اب یہ امیر المؤمنین کا عفو تھا کہ چونکہ محمد بن جعفر نے توبہ کی اور عاجزی وضع کرتے پر شرمندگی ظاہر کی تو اسے معاف کر دیا۔

(۳) زید النار بن موسیٰ (الکاظم) چند دن کے لئے اس شخص نے بصرہ میں شورش بپا کی۔ عباسیوں کے گھر جلا دیئے، لوگوں کا مال و متاع لوٹا باغوں کو آگ لگا دی۔ اس لئے زید النار کہلایا۔ جب گرفتار ہو کر امیر المؤمنین المامونؒ کے حضور پیش ہوا، تو آپ نے اپنے رحم و کرم کے سبب اسے معاف کر کے اسکے بھائی اور اپنے داماد امیر علی الرضا کے پاس بھیج دیا۔ مگر وہ اس حرکتوں سے اتنے ناراض تھے کہ مدت العمر اس سے بات نہیں کی (عمدۃ الطالب ص - ۲۱۰)

۴۔ ابراہیم الجزار بن موسیٰ (الکاظم) اس شخص نے یمن میں فساد کیا اتنے لوگوں کو قتل کیا اور ان کا مال لوٹا کہ اس کا نام الجزار پڑ گیا یعنی قصاب

گرفتار ہوتے پر امیر المؤمنین المامونؒ نے اسے بھی معاف کر دیا۔

(۵) اسماعیل بن یوسف بن ابراہیم بن موسیٰ بن عبداللہ بن الحسن بن الحسن بن علیؓ بن ابی طالب۔ اس شخص نے امیر المؤمنین المستعین باللہؒ کے زمانے میں مکہ معظمہ کو آجگاہ فساد بنایا۔ والبدایہ والنہایہ میں ہے (ج ۱۱ ص ۹، نیز طبری میں ہے۔

واخذ ما فی الکعبۃ من الذھب والفضۃ والطیب وکسوۃ الکعبۃ۔

کعبہ میں جتنا سونا، چاندی، عطر اور پردے غلاف تھے وہ سب لے لوٹ لئے۔

پھر بقول طبری (ج ۱۱ ص ۱۲۷، نیز البدایہ والنہایہ ج ۱۱، ص ۱۰) و اعترض الحجاج فقتل منھم جمعاً کثیرا ونھبھم (حاجیوں کے قافلے پر لوٹ پڑا۔ بہت سے لوگوں کو شہید کیا۔ اور ان کا مال لوٹ لیا) پھر یہی حرکتیں اس نے مدینہ طیبہ میں کیں۔

وھو الذی حاصر المدینۃ حتی مات اھلھا جوعاً ولم یصل احد فی مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اس شخص نے مدینہ طیبہ کا محاصرہ کر لیا۔ یہاں تک کہ وہاں کے لوگ بھوکوں مر گئے اور مسجد نبوی میں کوئی شخص نماز نہ پڑھ سکا۔

۶۔ محمد بن حسن بن محمد بن ابراہیم بن الحسن بن زید بن الحسن بن علی بن ابی طالب:۔ ۲۵۶ھ میں اس شخص نے امیر المؤمنین المعتمد علی اللہؒ کے زمانے میں خروج کیا۔ مسجد نبوی میں بیٹھ کر علانیہ شراب پیتا تھا اور بد فعلیاں کرتا تھا۔

امام ابن حزم فرماتے ہیں۔ (جمہرۃ الانساب ص ۴۳)

وکان من افسق الناس شرب

یہ نہایت درجہ فاسق تھا مسجد نبوی

الخمر فی مسجد النبی صلی اللہ علیہ وسلم نهاراً وفسق فیه یقیناً لبعض حرم اللہ وقتل لبعض اهل المدینة بالسیف والجوع وکان قیامه ایام المعتمد وقتل اهل المدینة ولم یصل بها طول مدته فیها جمعة وجماعة

میں علانیہ شراب پیتا تھا اور بعض اہل مدینہ کی چھوکریوں کے ساتھ بدفعلی کرتا تھا۔ .... اسنے اہل مدینہ کو تلوار اور بھوک سے مارا اس نے خلیفہ المعتمد علی اللہ کے زمانے میں بغاوت کی تھی۔ اہل مدینہ کو اسنے قتل کیا کہ جب تک اسکا تسلط رہا (مسجد نبوی میں) جمعہ کی نماز ادا نہ کی جا سکی۔ اور نہ جماعت کی۔

۔ محمد بن الحسین بن جعفر بن موسیٰ (الکاظم) اسنے اور اسکے بھائی علی بن الحسین نے مدینہ طیبہ میں بغاوت کی ۲۷۱ھ کا واقعہ ہے امیرالمومنین المعتمد علی اللہ ہی کا عہد تھا۔ اس بغاوت کے احوال امام ابن حزمؒ اس طرح بیان کرتے ہیں۔ (جمہرۃ الانساب ص ۵۸)

وهما اللذان قاما فی سنة ۲۷۱ھ بالمدینة فقتلا اهلها واخذا اموالهم واخربا المدینة حتی بقیت لا یصلی فی مسجد رسول اللہ علیه وسلم شهراً کاملاً لا جمعة وجماعة اصلاً وقتل محمد بن الحسین حین قیامه ثلاثة عشر رجلاً من ولد جعفر بن ابی طالب

ان دونوں نے مدینہ طیبہ میں ۲۷۱ھ میں بغاوت کی۔ وہاں کے لوگوں کو قتل کیا اور ان کا مال لوٹا مدینہ طیبہ کو ایسا تباہ کیا کہ مسجد نبوی میں پورے ایک مہینے نہ جمعہ ہو سکا اور نہ جماعت کی قطعاً کوئی نماز ہو سکی اور اس محمد بن الحسین نے اپنے تسلط کے دوران حضرت جعفر بن ابی طالب کی اولاد میں سے تیرہ حضرات کو پکڑ کر شہید

رضی اللہ عنہ صیرا وھو کر دیا۔ اس لئے اسکا لقب ملیط ملقب بالملیط۔ ہو گیا (یعنی خبیث بے ننگ ذنام)

ان نام نہاد "سادات کرام ابناء رسول اللہ" کی حرکتوں کے یہ چند نمونے ہیں اور ان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ لوگوں کے قلوب ان سے کیوں متنفر رہے۔ اور کس وجہ سے آل علی کی خلافت قائم ہونے کی تمام کوششیں ناکام رہیں۔ اس قسم کی حرکتیں صرف انہی سات آٹھ آدمیوں کی نہ تھیں، ان پینسٹھ میں سے اکثر کا کردار ایسا ہی پست اور شرمناک تھا، تفصیل طویل ہے اور موجب ندامت

اب اموی اور عباسی خلافتوں پر تنقید کرنے والوں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ تمام جرائم جن کا صدور بعض آل علی سے ہوا، ان کا ذکر نہیں کرتے اور انہی جرائم کو کذباً وافتراءً اموی اور عباسی خلفاء پر تھوپ دیتے ہیں، اتنا نہیں سوچتے کہ اگر خلفاء کرام نے ایسی حرکتیں کی ہوتیں اور ان بعض علویوں نے اپنی پاک بازی اور عدل گستری کی کوئی مثال قائم کی ہوتی یا امت نے ان کی کارروائیوں کو کسی درجے میں تعمیری سمجھا ہوتا تو امویوں اور عباسیوں سے ان کے دل پھر جاتے اور ان علویوں کی طرف قلوب مائل ہو جاتے، انھیں کامیاب کرنے کے لئے مسلمان جوق در جوق جان و مال کی بازی لگانے کیلئے کھڑے ہو جاتے۔ لیکن عالم یہ تھا کہ ان میں سے کوئی ایک خروج بھی ایک ناکام وقتی ہنگامے سے زیادہ کچھ نہ ہو سکا۔ اور امت کے قلوب خلافت قائمہ ہی کی طرف جھکے رہے۔

ابن علقمی اور اس کے سبائی ساتھیوں نے آل علی کی خلافت قائم کرنے کے لئے ہلاکو خاں سے ساز باز کی اور مرکز خلافت تباہ کرا دیا۔ مگر نتیجہ صرف

یہ نکلا کہ امت پر بلا نازل ہوئی۔ ان کی بستیاں اجڑ گئیں، لیکن آل علی کی خلافت قائم ہونے کی بجائے مصر میں پھر خلافت عباسیہ ہی قائم ہو گئی۔ مسلمانوں نے بعد میں ان تاتاریوں کا وہ قلع قمع کیا کہ سب بدلہ لے لیا گیا۔ یعنی یہ لوگ اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کی اخلاقی برتری سے ایسے متاثر ہوئے کہ گروہ گروہ آکر اسلام قبول کرتے تھے۔ یوں عالم اسلام میں دعوت محمدیہ کی نشاۃ ثانیہ کا اللہ تعالٰے نے انتظام کر دیا۔ پاسبان مل گئے کعبہ کو صنم خانوں سے۔

ہمارے زمانے میں اسی علوی خلافت قائم کرنے کی ہوس میں شریف حسین نے نصاریٰ سے ساز باز کی۔ اسلحہ اور اشرفیوں کے صندوق کے صندوق وصول کر کے بغاوت کی پوری پوری تیاری کی۔ اور عین اس وقت جب ترکی خلافت کے امیر المؤمنین نے کفار کے خلاف اعلان جہاد کیا، اس شخص نے کفار کے ساتھ ہو کر امیر المؤمنین کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کر دیا۔ ترکی امیر عسکر کو جب اس کی ریشہ دوانیوں کی خبر ہوئی اور انھوں نے اس سے باز پرس کی تو اس شخص نے خاص حرم شریف میں کعبہ کے قریب کھڑے ہو کر حلفیہ بیان دیا کہ افواہیں غلط ہیں اور میں پوری طرح عہد وفاداری پر قائم ہوں، وہ صاحب ایمان شخص تھے مطمئن ہو گئے۔ لیکن شریف حسین اور اس کے لوگوں نے جو حرکتیں کیں، جس طرح خاص حرم شریف میں ترکوں اور مخلص مسلمانوں کو شہید کیا، ان دلدوز واقعات کے عینی شاہد۔ شاید اب بھی موجود ہوں۔ مولانا خلیل احمد انصاریؒ نے بذل المجہود فی حل ابی داؤد میں ایک حدیث پر بحث کرتے وقت یہ سب تفصیلات عینی شاہدوں سے معلوم کر کے بیان کی ہیں۔ جو حرم کے علماء و فقہاء میں ہیں۔ (کتاب الفتن

الملاحم ج ۵، ص ۸۹) اس شخص نے محض امت کا کلمہ ہی متفرق نہیں کیا
بر امام المسلمین کے خلاف بغاوت ہی نہیں کی، محض حرم میں بے گناہ مسلمانوں
کو شہید ہی نہیں کیا۔ بلکہ اپنے نصرانی آقاؤں کو خوش کرنے کے لئے بعض
مسلمان خواتین تک کی وہ بے حرمتی کرائی جس کے بیان کو قلم کا سینہ شق ہوتا ہے
اسی کے نتیجہ میں عالم اسلام پر وہ مصائب ٹوٹے کہ بظاہر ابھی فلاح
کا وقت دور نظر آتا ہے۔ عرب کے ٹکڑے ہو گئے۔ فلسطین پر یہود قابض
ہیں اور تمام بلاد عربیہ و اسلامیہ کفار کی ترک و تاز سے نیم جان ہیں لیکن
اللہ کا وعدہ قائم ہے۔ اس دور ابتلاء سے مسلمان پھر ابھریں گے۔ جسکے
اب آثار پیدا بھی ہو رہے ہیں۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ۔

اندلس کی اموی امارت وخلافت

امیر عبدالرحمٰن اموی الداخل نے اگرچہ خلیفۂ
عباسی سے بیعت نہیں کی تھی لیکن خلیفۂ اسلام انہی کو جانتے تھے جیسا کہ
خود فرمایا ہے اور اوپر مذکور ہوا۔ ہونا یہ چاہئے تھا کہ عباسی خلافت اور اموی
امارت میں انتہائی چشمک اور عداوت ہوتی۔ لیکن امیر المؤمنین المنصور
نے ابتدائی ناکامی کے بعد اندلس فتح کرنے کا خیال چھوڑ دیا۔ اور یوں بے تعلقی
کی سی فضا قائم ہو گئی۔ لیکن یہ بے تعلقی سیاسی تھی، دینی اور خاندانی تعلقات
بدستور قائم رہے۔ دونوں مملکتوں کے شہری اطمینان سے آتے جاتے تھے
جس طرح اموی سادات کو خلافت عباسیہ میں اہم مناصب دئے گئے اور
بعض خاص مراعات سے نوازا گیا۔ اسی طرح بعض عباسی سادات کا قیام
اموی امارت اندلس میں ثابت ہے۔ امام ابن حزم نے متعدد عباسیوں کا
اندلس میں حکومت کے مہمانوں کی حیثیت سے رہنا بیان کیا ہے۔ پھر تحصیل

علم یا سیر و سیاحت کے لئے اندلس سے مسلمانوں کا بلاد عربیہ میں آنا جاری رہا اندلس کے ایک عظیم عالم حضرت امام یحییٰ بن یحییٰ المصمودی جو موطا شریف کے راوی ہیں وہی اس کو اندلس لے گئے تھے اور وہاں وہ عظیم کتاب ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ علاوہ ازیں ملی وحدت اور دینی اخوت خود موطا شریف کی تدوین سے ثابت ہے اور اندلس میں اس کی وہی حیثیت ہوئی جو خلافت عباسیہ میں تھی۔ ہمارے بیان پر شاہد عادل ہے۔ اموی حکمرانوں نے یہ خیال نہیں کیا کہ اس کی تدوین عباسی امام نے کرائی ہے، علم کے بارے میں سیاسی یا نسلی یا لسانی کوئی امتیاز نہیں برتا جاتا۔ اور نہ مسلمانوں کے ہاں علم کی اجارہ داری کسی خاص خاندان میں تسلیم کی گئی بلکہ اسے اخوت روح اسلامی کے خلاف جانا۔

چنانچہ موطا کی تالیف میں اس کا کوئی خیال نہیں کیا گیا کہ روایت فلاں خاندان کے افراد کی ہے۔ اسے نہ لیا جائے۔ یا اس کے راوی کا فلاں سیاسی موقف تھا۔ اس لئے اس کی روایت قبول نہیں جائے گی

وہاں صرف راوی کی عدالت اور اس کا علمی مقام دیکھا جاتا تھا چنانچہ اس میں جہاں ہاشمی سادات کی مرویات اور فتاوی ہیں وہاں اموی سادات کی مرویات و فتاوی کو بھی وہی حیثیت دی گئی ہے۔ جمل وصفین میں حصہ لینے والے یا غیر جانب رہنے والے یا بعد کے سیاسی نزاعات میں فریق بننے والے سب سے اس کتاب میں یکساں استفادہ کیا گیا ہے۔ عباسی ائمہ نے امام مالک سے جب اس کی سماعت کی تو حضرت امیر المؤمنین معاویہؓ امیر المؤمنین مروانؓ اور امیر المؤمنین عبد الملکؒ کی وہی علمی اور روحانی عظمت تسلیم کی جو حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی تھی بلکہ عبد اللہ بن الزبیرؓ

کی بھی جن کی سیاسی چپقلش امویوں اور ہاشمیوں دونوں سے رہی، اسی طرح اندلس کی اموی امارت اور پھر خلافت میں ہاشمی سادات اور ابن الزبیرؓ اور دوسرے وہ حضرات جو سیاسیات میں غیر جانب دار رہے۔ ان سب کی یکساں حیثیت تسلیم کی گئی۔ اور سب کے ارشادات قانونی نظائر کی حیثیت سے سنے اور سمجھے جاتے رہے۔ وہاں ایسا کوئی تصور نہیں تھا کہ "ہم صرف اپنے سلسلہ امامت ہی پر انحصار کرتے ہیں۔ اور بس"۔

اب ایک اور دلچسپ واقعے کی تفصیل ملاحظہ ہو جس سے اندازہ ہوگا کہ دینی اور ملی معاملات میں عباسی خلافت اور اموی امارت میں ہمیشہ یگانگت اور باہمی اعانت کا تصور قائم رہا۔ مثلاً امیر المؤمنین المامونؒ کے زمانے میں اندلس کے امیر عبدالرحمٰنؒ الثانی تھے۔ اس زمانے میں مصر کے والی امیر زیادۃ اللہؒ نے صقلیہ (سسلی) پر دھاوا بول رکھا تھا۔ قاضی اسد بن فراتؒ کئی شہر فتح کرنے کے بعد شہید ہو چکے تھے، پھر محمد بن الجواریؒ نے قیادت سنبھال لی اور وہ بھی متعدد فتوحات کے بعد ۲۱۲ھ میں وفات پا چکے تھے۔ اب امیر عسکر زہیر بن غوث تھے انھوں نے متعدد فتوحات کے بعد شکست کھائی اور اسلامی لشکر محصور ہو گیا۔ اتنے میں رومیوں کی طرف سے ایک بڑی امدادی فوج بھی آگئی جس سے مجاہدوں میں ہراس پھیل گیا اسی عالم میں اچانک اندلسی بحری بیڑا ادھر سے گزرا جس میں تین سو جہاز اور بیس ہزار سپاہی تھے، اس بحری لشکر کے افسر فرغوش تھے رحمۃ اللہ علیہ۔ انھوں نے جو صورت حال دیکھی تو وہیں رک گئے اور مسلم فوج کا ساتھ دیا۔ ادھر امیر زیادۃ اللہؒ کی طرف سے بھی مسلمانوں کو کمک پہونچ گئی، اب اسلامی لشکر کافی طاقتور ہو گیا۔ فوج کی جدید ترتیب دی گئی اور سب نے بالاتفاق

اس کی کمان امیر فرعوش اندلسی کے سپرد کردی لیکن پھر مسلمان شکست کھا گئے یہ صورت دیکھ کر امیر فرعوش وہاں سے ہٹ گئے اور بلرم پر حملہ کر کے اس کا محاصرہ کر لیا تا آنکہ فتحیاب ہوئے اور یوں پالا لشکر اسلام کے ہاتھ رہا۔ اس عظیم الشان فتح کے بعد امیر فرعوش کا بیڑا اپنے بھائیوں سے رخصت ہوگیا۔ انھوں نے یہ نہیں چاہا کہ اس فتح کے ثمرات میں حصہ بٹائیں عباسی لشکر کی یہ امداد محض فی سبیل اللہ کی گئی تھی اور صرف دینی اور ملی جذبہ کار فرما تھا (ملاحظہ ہو نصیر احمد جامعی کی کتاب "مسلمان سسلی میں" ص ۴۸ و ۴۹، طبع سنگ میل پبلیکیشن لاہور)

اب ملاحظہ ہو یورپ کے مورخوں کا یہ افترا محض کہ اندلس کے حکمرانوں کو زیر کرنے کے لئے امیر المؤمنین ہارون الرشید نے شاہ فرانس شارلمین سے تعلقات قائم کئے تھے اور اس درجہ اس کی استمالت انھیں منظور تھی کہ بیت المقدس کے کلیسا کی کنجیاں اسے بھجوادیں۔ دوسری طرف کہا جاتا ہے کہ اندلس کی اموی امارت نے بازنطینی حکمراں سے اپنے تعلقات استوار کئے تاکہ عباسی خلافت کو وہ پریشان کرتا رہے۔ یورپ کے مورخوں کی اس ہرزہ سرائی کا کوئی سراغ ہمیں قدیم مسلم مورخوں کے ہاں نہیں ملتا حالانکہ اگر اس منظر کشی میں صداقت کا شائبہ بھی ہوتا تو اس کا ذکر ضرور کرتے در اصل یہ نصرانی مورخوں کے احساس کمتری کی ایک علامت ہے۔ ان کے سامنے مشرق و مغرب کے مسلمانوں کا تمدنی، تہذیبی، معاشرتی اور علمی تفوق تھا اور اقوام عالم پر ان کی سیاسی برتری تھی۔ ان کے مقابلے میں یورپ کی ذہنی روحانی، علمی، معاشرتی اور سیاسی پستی تھی۔ اس لئے انھوں نے عباسیوں اور امویوں کے مابین چپقلش بیان کر کے اپنے عوام کو تسلی دینے کی کوشش

کی ہے کہ ہمارے بادشاہ ایسے عظیم المرتبت تھے کہ مسلم حکمرانوں کو اپنے معاملات میں انکی امداد کی احتیاج رہتی ہے۔ یعنی کافروں کی مدد سے وہ ایک دوسرے کو زیر کرنا چاہتے تھے۔

اب ایک طرف دیکھا جائے وہ واقعہ جو اوپر بیان ہوا۔ اور دوسری طرف یورپ کے مورخوں کی یہ افترا پردازی، ان دونوں میں کوئی وجہ تطابق نظر آتی ہے؟۔ اموی سادات کرام کی عظمت و شرف اور ان کی للہیت دینی غیرت اور امور ملیہ میں تقوٰی شعاری کی ہم ایک اور مثال دینا چاہتے ہیں جب عباسی خلافت روبانحطاط ہوئی۔ ایک طرف مشرق میں مجوسی الاصل بویہی خاندان امور خلافت پر مستولی ہو گیا۔ اور دوسری طرف مغرب میں دوسرا مجوسی الاصل عبیدی خاندان، اور یوں خلیفۂ عباسی کی حیثیت ایسی نہیں رہی کہ وہ آزادانہ فرائض امامت انجام دے سکیں تو اموی امیر عبدالرحمٰن الناصرؒ نے علما و فقہا کا ایک اجلاس طلب کیا کہ خلیفۂ اسلام کے عجز کی بنا پر کیا اسکا امکان ہے کہ میں اپنے آپ کو خلیفہ کہہ سکوں۔ کیونکہ وہ اب اپنے فرائض صحیح طریقے پر ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ ہمارے اور ان کے درمیان عبیدی ملاحدہ کی حکومت اور پھر سمندر حائل ہے۔ تو اس وقت علما نے فتوٰی دیا کہ ایسی صورت میں دو خلافتیں قائم ہو سکتی ہیں۔ تب امیر عبدالرحمٰن الناصرؒ نے اپنی خلافت کا اعلان کیا۔ اور امیر المؤمنین کہلائے اموی ذہنیت یہ نہیں تھی کہ جب چاہا اور جہاں چاہا چند آدمی جمع کئے اور خلافت کا اعلان کر دیا پھر چاہے نتیجہ کچھ بھی نکلے۔ اموی حضرات ہر معاملے میں قواعد شرعیہ اور مفاد ملت پیش نظر رکھتے تھے۔ ویسے ہر خاندان میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں اور حالات کبھی سازگار ہوتے ہیں اور کبھی نہیں

سیاسی مدوجزر تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی دیکھنے کی ہے کہ امیر المومنین الناصر نے عباسی خلیفہ کی آئینی حیثیت کا انکار کر کے اپنی خلافت کا اعلان نہیں کیا۔ بلکہ ان کو خلیفہ اسلام تسلیم کر کے ایک شرعی جواز تلاش کیا کہ ایسے احوال میں دو خلافتیں ہو سکتی ہیں۔ اگر دین کے بجائے خاندانی عصبیت کا جذبہ ہوتا تو خلیفہ عباسی کی خلافت کا انکار کر کے اپنی خلافت قائم کرتے۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ ایسا اقدام ملت اسلامیہ کے ساتھ غداری ہوتا اور اس سے امت کا کلمہ متفرق ہو جاتا۔

برخلاف اس کے آل علی میں سے جتنے لوگوں نے اموی اور عباسی دور میں خروج اور بغاوتیں کیں وہ چونکہ تعمیری نہ تھیں اور نہ انکا کوئی ملی نصب العین تھا، اس لئے امت میں انھیں کبھی مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ کیونکہ شخصی طالع آزمائی کے علاوہ ان کا کوئی مطمح نظر نہ تھا۔ پھر امت اس گروہ سے بھی نالاں تھی جنھوں نے وقت بے وقت بلکہ ہمیشہ بے وقت ان علویوں کو ابھار کر میدان میں کھڑا کیا۔ اور پھر بے یار و مددگار چھوڑ کر بھاگ گئے۔

وجہ یہ بھی ہے کہ اموی خلافت خالص عربی حکومت تھی اور عرب اس کیلئے تیار نہ تھے کہ اپنی حاکمیت ختم کر دیں۔ اس لئے اموی دور میں علویوں کو ناکامی ہوئی۔ دعوت عباسیہ میں تمام مسلمانوں کی حاکمیت کا تصور تھا اور ہر اسلامی ملک کو حکومت چلانے کی دعوت تھی۔ اگر علویوں کا تصور بھی ایسا ہی ہوتا تو شاید وہ کامیاب ہو جاتے مگر ان کے ہاں تو مدار اس پر تھا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذریت ہیں۔ اس لئے تمام امت کو ہماری حاکمیت تسلیم کرنی چاہیئے۔ چنانچہ ان میں سے جو بھی کھڑا ہوا اس نے اپنے "ابن رسول اللہ" ہونے ہی پر اپنے دعوے کی بنیاد رکھی، آسمان

ورزمین نے یہ منظر دیکھا ہے کہ ایک ہی خلیفہ کے خلاف کئی کئی "ابنائے رسول اللہ" کھڑے ہو گئے۔ مگر ان میں نہ باہم کوئی رابطہ تھا نہ حکومت قائمہ کا تختہ الٹنے کا سامان، اور نہ انقلاب کے بعد کوئی نصب العین۔ جسے موقعہ ملا اس نے سو دو سو ہزار دو ہزار عجمی لوگوں کو اپنے ساتھ ملایا۔ اور بغاوت کا جھنڈا بلند کر دیا، اور وہ بھی اپنے ہی خاندان کے دوسرے مدعیوں کے خلاف حریفانہ اگر کھڑے ہوتے تو کم از کم وقتی طور پر تو متحد رہتے۔

تاریخ کا طالب علم جب ان لوگوں کے "یہ کارنامے" دیکھتا ہے تو حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ یہ ہے وہ تعمیر اور ارتقار امت، اور اہل عالم کے لئے دائمی عدل عمرانی کی دعوت جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جاری کی اور جس کے لئے آپ کے اصحاب کرام رضی اللہ عنہم نے جان ومال کی بازی لگائی پہلی صدی ہجری سے لے کر اس چودھویں صدی ہجری میں شریف حسین کی بغاوت تک ایک ہی منظر سامنے آتا ہے ایسے باغیوں کی امداد وحمایت کا اتہام امام اعظم ابو حنیفہؒ پر عائد کیا گیا جس کی حقیقت پچھلے اوراق میں کھول دی گئی ہے۔ اب یہ امت مرحومہ پر اللہ کا فضل ہے، اس کی دعوت کی حقانیت ہے، رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی معجزانہ برکت ہے، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کرامت ہے کہ تمام نہاد "ابنار رسول اللہ" کی لائی ہوئی ہر مصیبت یہ امت جھیل گئی۔ اور رہ کر اپنی ہستی اپنی دعوت اور اپنے عزائم بروئے کار لانے کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر کے تائید ایزدی سے اپنی نشأۃ جدیدہ کا انتظام کرتی رہی اور اب بھی یہی توقع ہے کہ پھر اس امت کو اقوام عالم میں وہی مقام حاصل ہو گا جو فطری طور پر اس کا ہے وَلِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ بِنَصْرِ اللّٰهِ (الروم ۴)

اختلاف مذاہب

امیر المومنین المامونؒ کے عہد مبارک میں ایک نصرانی شخص نے اسلام قبول کیا۔ اور کچھ دن بعد مرتد ہو گیا۔ امیر المومنین نے اسے اپنے ہاں طلب کر کے پوچھا کہ "اسلام سے تمہیں وحشت کس سبب سے ہوئی؟" اس نے کہا۔ آپکے دین میں مجھے اختلاف کی کثرت نظر آئی۔" آپ نے فرمایا۔ "ہمارے ہاں اختلاف دو قسم کا ہے ایک تو ایسا جیسے اذان کا ہے، جنازے کی تکبیروں کا ہے، پھر تشہد کے اختلافات ہیں۔ عیدین کی نمازوں کے ہیں، ایام تشریق کی تکبیروں کے ہیں۔ قراتوں کے ہیں اور فتوے دینے کی دلیلوں کے ہیں اور ایسے ہی اور اختلافات ہیں۔ تو ان کو اختلاف نہیں کہا جاتا بلکہ یہ اختیار، توسع ہے اور تکلیف دور کرتا ہے۔ جس نے اذان کے کلمات دو دو دفعہ کہے لیکن اقامت میں یہ کلمات ایک ایک دفعہ کہے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ اسی طرح اذان میں بھی دو دو دفعہ کلمات کہے اور اقامت میں بھی تو اس پر لوگ نہ ایک دوسرے کو عار دلاتے ہیں اور نہ عیب نکالتے ہیں۔ یہ بات تم عیاناً تم خود ہی دیکھ رہے ہو اور ہمارے اس بیان کے گواہ ہو۔"

دوسرا اختلاف وہ ہے جو ہماری کتاب کی کسی آیت یا ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ارشاد کی تاویل میں ہو۔ حالانکہ ہم خدا کی طرف سے آیت کے نزول پر اور حدیث کی صحت پر متفق ہیں اگر تمہاری وحشت کا سبب یہ ہوا ہو اور اسی وجہ سے تم ہماری کتاب کا انکار کرتے ہو۔ تو پھر تورات اور انجیل پر بھی ایسا ہی اتفاق ہونا چاہئے جیسا کہ ان کے الفاظ کا خدا کی

طرف سے ہونے پر اتفاق ہے۔ اور یوں یہود و نصاریٰ میں تفسیر کے سلسلے میں کوئی اختلاف نہ ہونا چاہئے۔ ..... اگر اللہ چاہتا کہ کتاب ایسی نازل کرے اور انبیاء اور ان کے نائبوں کے اقوال اس نہج پر ہوں کہ تفسیر میں کوئی اختلاف نہ ہو سکے تو وہ ایسا کر سکتا تھا۔ لیکن ہم دینی اور دنیوی امور میں ایسا کہیں نہیں دیکھتے کہ خدا نے وہ چیز اتاری ہو جو ہر حال میں کفایت کرے۔ اگر وہ ایسا کرتا تو آزمائش اور محنت نہ رہتی اور ایک دوسرے پر سبقت لے جاتے اور مقابلے پر کامیابی حاصل کرنے کا جذبہ پیدا نہ ہوتا۔ آخر وہ شخص پھر اسلام لے آیا۔ اور امیر المؤمنین نے سجدۂ شکر ادا کر کے حاضرین سے فرمایا آج اس پر روپیہ دے کر کچھ احسان مت کرنا تاکہ اس کا اسلام آزاد نہ ہو۔ اور اس کا دشمن یہ نہ کہہ سکے کہ لالچ کے سبب مسلمان ہوا۔ مگر آئندہ اس کے ساتھ بھلائی کرتے اسے امداد دیتے اور اس کا دل لبھاتے ہیں کہ مت رکھنا (ضحی الاسلام، ج ۱ ص ۳۰۱)

امیر المؤمنین المامون نے اس حسن کے ساتھ یہ مسئلہ صاف کر دیا، کہ فقہاء اور متکلمین کے جو اختلافات ہیں ان سے علم میں ارتقا ہوتا ہے۔ لیکن یہ اختلاف فرقہ بازی کا موجب نہیں ہونا چاہئے۔ اور جماعت کی مضبوطی اور امت کی وحدت پر حرف نہیں آنا چاہئے اور نہ ایسی کوئی حرکت ہونی چاہئے جس سے مسلمانوں کا حال و استقبال تباہ ہونے کا خطرہ ہو۔ یہ جو بات بات پر کفر کے فتوے لگتے ہیں حتیٰ کہ مسجدیں بھی الگ کر لی ہیں اور ایک دوسرے کے بزرگوں پر سب و شتم کا بازار گرم ہے۔ اس کی اجازت نہیں، جو لوگ یہ حرکت کریں اور متحارب گروہ بن کر امت کا کلمہ متفرق کریں، ان سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے (الانعام، ۱۶) اِنَّ الَّذِیْنَ

فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ (جن لوگوں نے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا اور گروہ گروہ بن گئے (اے نبی) تمہارا ان سے کسی معاملے میں کوئی تعلق نہیں۔)

سب اپنے اپنے فقہی اور کلامی مسائل پر قائم رہیں۔ مگر ایسی باتوں سے احتراز کریں جو دوسروں کے لئے موجب اذیت ہوں اور منافرت پھیلے تو ہمیں حکم ہے کہ کلمہ کی حرمت برقرار رکھیں ارشاد نبوی ہے

عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من صلّٰی صلوٰتنا واستقبل قبلتنا واکل ذبیحتنا فذلک المسلم الذی لہ ذمۃ اللہ وذمۃ رسولہ فلا تخفروا اللہ فی ذمتہ (رواہ البخاری)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، جس نے ہماری طرح نماز پڑھی۔ ہمارے قبلے کی طرف رخ کیا اور ہمارے ہاتھ کا ذبیحہ کھایا تو یہ شخص ایسا مسلمان ہے کہ اسے اللہ اور اس کے رسول کی پناہ حاصل ہے۔ ایسے شخص کے بارے میں تم اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری پر حرف مت لاؤ۔

لیکن جب یہ ہی شخص قرآن پاک کے کلمات میں ردو بدل اور تحریف ثابت کرنا چاہے، مہاجرین اور انصار کو مرتد کہے اور ان کی راہ سے ہٹ کر چلے۔ اور دین میں وہ باتیں نکالے جو اس میں نہیں ہیں اور پھر اپنا جتھہ الگ بنا کر امت کا کلمہ متفرق کرنا چاہے تو اس پر مذکورہ بالا تعریف صادق نہیں آتی اس کیلئے اللہ تعالیٰ نے یہ وعید رکھی ہے۔

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا۔

جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی حالانکہ ہدایت اس پر واضح ہو چکی تھی اور ایسی چال چلا جو اہل ایمان کی راہ نہیں تو ہم بھی اسکا منہ اسی طرف پھیر دیں گے جدھر اسنے رخ کر رکھا ہو۔ اور پھر اسے جہنم میں جھونکدیں گے اور وہ برا ٹھکانہ ہے۔

ایک قابل توجہ جائزہ۔ اموی اور عباسی خلافتوں کے دینی اور آئینی حیثیت کم کرنے کی بعض مورخ و مصنف کتنی ہی کوشش کرلیں۔ روایات واہیہ کو حقائق کا رنگ دینے کے لئے کتنا ہی زور قلم صرف کردیں یہ صورت حال اپنی جگہ دائم و قائم ہے۔ کہ ان خلافتوں کا نظام قرآن و سنت پر مبنی تھا اور اس کے چلانے والے، اول تو اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے جن کے اسمار گرامی ہمیں امیر المؤمنین ولید اول کے عہد مبارک و مسعود تک ملتے ہیں جنہوں نے اموی عہد میں مشرق و مغرب میں اسلام کا پرچم لہرایا۔ پھر تھے صحابۂ کرام کے تربیت دادہ، ان کے مخلص اتباع اور ان کے بعد ان کے اتباع جو ملت اسلامیہ کے عظیم ترین علماء و فقہاء، وائمہ ہیں ۱۵۰ھ تک کا زمانہ جو خیر القرون کہلاتا ہے۔ وہ صحابۂ کرام اور ان کے اتباع کا عہد ہے اور اسی مدت میں احکام دین کے کلیات وجزئیات پوری طرح مدوّن ہو کر محفوظ ہو گئے۔

اب ایک طرف تو یہ حقیقت ثابتہ ہے اور دوسری طرف سبائیوں کی اور ان سے متاثر مؤلفوں کی تحریریں ہیں، جو طیّلتاً ہر صاحب فکر کے دلیں

کھرچن پیدا کرتی ہیں۔ کہ یہ قرآن حکیم کیسی آخری کتاب ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح کے آخری رسول ہیں اور یہ امت کونسی قسم کی آخری امت ہے کہ اپنے ہادی و مولیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا بر پا کردہ نظام تیس برس بھی اچھی طرح نہ چلا سکی اور پھر اس کا عالم ایسا ابتر ہو گیا کہ غاصبان خلافت کے مظالم سہتی رہی، حکومت کے ہاتھوں دین مبین کے اصول و قواعد کی پامالی دیکھتی رہی اور صدیوں ان ظالموں اور غاصبوں کے دامن سے عقیدت اور وابستگی کی معصیت میں مبتلا رہنے کو تقاضائے دین باور کرتی رہی اور نام نہاد "آل رسول" میں سے جو لوگ ان ظالموں غاصبوں اور دین سے بے پروا حکمرانوں کے پنجۂ استبداد سے نجات دلانے کو بارہا کھڑے ہوئے، انکی حمایت و نصرت سے اپنا دامن بچاتی رہی۔ اگر اسی پر بس ہوتا تو اہل عالم اسے امت کی بے حسی سمجھ لیتے۔ مگر اس نے تو بے راہ روی کی حد کر دی کہ ظالم و غاصب حکمرانوں کے ایک اشارے پر جوق در جوق جان و مال کی بازی لگانے اور ان کی حکومت کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کرنے کے لئے ہمہ تن مصروف جہاد ہو جانا اس کا شعار رہا۔

اس امت کی فرض شناسی کی انتہا یہ ہے کہ جب "ظالم و جابر" بنی امیہ کا تختہ الٹ دیا گیا۔ اور ان میں سے تنہا ایک شخص راہ کے تمام مصائب جھیلتا ہوا۔ اندلس پہنچا تو وہاں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ کسی نے نہ سوچا کہ یہ ایک دشمن دین گھرانے کا فرد ہے۔ اور یوں ہسپانیہ میں پھر اسی ظالم و جابر اور دین سے بے بہرہ اموی خاندان کی ایسی حکومت قائم ہو گئی جہاں کئی صدیوں تک وہ علماء و فضلا پیدا ہوتے رہے جن کی علمی کاوشوں پر مسلمانان عالم کو آج تک کیا کچھ فخر و ناز ہے۔

یہ تھے قریش کے بطل جلیل اور بنی امیہ کے سورما امیر عبدالرحمٰن الداخل
آپ سے جب اندلس میں دریافت کیا گیا کہ بیعت خلافت کی لینا چاہتے ہیں
یا امارت کی تو اس مرد حق نے فرمایا " خلافت کی بیعت مشرق (عراق) میں
ہو گئی - میں صرف امیر ہوں" آپ اگر چاہتے تو اندلس میں حریف خلافت
قائم کر سکتے تھے - مگر اموی سادات امت مسلمہ کے خادم اور خیر خواہ تھے
ان کی للّٰہیت نے اجازت نہ دی کہ منصب خلافت کا استحقاق کریں - اور
جماعۃ المسلمین کے اجماع کی بے وقعتی کے مرتکب ہوں -

پھر اس مرد حق اور شہباز صداقت و عظمت کی یہ بات بھی سبائیت
زدہ مؤلفین کے لئے خاص کر حیرت انگیز ہے کہ اس کی آنکھوں کے سامنے
انقلاب آیا - اس کے خاندان کی حکومت چلی گئی، لیکن ہسپانیہ جا کر اس نے
ان بہیمانہ حرکتوں میں سے کسی ایک کا بھی تذکرہ نہیں کیا - جو اموی سادات
کرام کی قتل عام، ان کے مقابر کے انہدام اور ان کی لاشوں کی بے حرمتی
کے دلدوز مناظر کا خاکہ پیش کرنے میں ابو مخنف جیسے کذّاب نے ابتدا کی
پھر سبائی مصنف زور قلم صرف کرتے رہے جن سے دوسرے لوگ اپنی
کتابوں میں اندھی تقلید سے نقل کر کے چلے آرہے ہیں - اگر ایسی کوئی بات ہوئی
ہوتی تو اندلس کے مورخوں کی تحریروں میں کچھ تو انکا تذکرہ ہوتا انقلاب
حکومت میں کشت و خون اتنا ہی ہوا جتنا فوجی انقلاب میں عموماً ہوتا ہے
اس سے زیادہ سب کذب محض ہے -

علاوہ ازیں اس امت کی یہ بات بھی ہر دل میں کھٹک پیدا کرتی ہے
کہ جب تاتاریوں کے ساتھ سبائی رافضیوں کی ساز باز کے نتیجے میں خلافت
عباسیہ مشرق میں ختم ہوئی - بغداد شریف کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی

تو پھر بھی اطمینان کا سانس لینے کی بجائے مسلمانوں نے ضروری یہ سمجھا کہ نئے سرے سے انہی ظالم و غاصب عباسیوں کی خلافت مصر میں قائم کی جائے۔ حالانکہ ان خلفاء کے ہاتھ میں اب فوجی و حربی طاقت بھی نہیں تھی مگر عالم اسلام میں انہی خلفا کو پیشوائے امت سمجھا جاتا تھا حتیٰ سلاطین ہند کے کتبوں درسکوں میں انکے اپنے ولقب کے ساتھ قسیم امیرالمؤمنین، نائب امیر امیرالمؤمنین لکھے جاتے تھے، اور بعض کتبوں میں خلیفہ عباسی کے نام کی صراحت بھی تھی۔ شاہان دہلی کے علاوہ سلاطین بنگالہ، سلاطین مالوہ و بہمنیہ دکن و جونپور سب کی عقیدت کی یہ کیفیت تھی وہ اپنے کو مستقل بادشاہ و سلطان نہیں جانتے تھے بلکہ عباسی خلیفہ زماں کا نائب اپنے کو سمجھتے اور کہتے تھے سلطان محمد تغلق شاہ کو اس بارے میں جو غلو تھا۔ ضیاء برنی مصنف تاریخ فیروز شاہی نے تفصیلاً ذکر کیا ہے ابتدائی فقرات ملاحظہ ہوں۔

در خاطر سلطان افتاد کہ سلطنت و امارت سلاطین بے امر دادن خلیفہ کہ از آل عباس بود درست نیست و ہر بادشاہے کہ بے منشور خلفائے عباسی بادشاہی کردہ است یا بادشاہی کند متغلب بودہ است و متغلب بود۔

سلطان (محمد تغلق شاہ) کے دل میں آیا کہ خلیفہ عباسی کی اجازت کے بغیر سلطنت و حکومت جائز نہیں۔ جن بادشاہوں نے خلفائے عباسی کے فرمان کے بغیر حکومت کی ہے یا آیندہ کریں وہ غاصب تھے اور غاصب ہوں گے۔

چنانچہ ۷۴۴ھ میں سلطان مذکور کی عرضداشت پر دربار خلافت عباسیہ مصر سے جب خلعت دلوائے سلطنت اور فرمان آیا سلطان نے تمام ارکین دولت و علماء و مشائخ کے ساتھ شہر سے باہر نکل کر استقبال کیا اور سواری سے اتر کر فرمان و خلعت کو سر پر رکھا۔ اس کے درباری شاعر بدر چاچ نے متعدد قصائد

بارے میں لکھے ایک قصیدے کے یہ چند شعر سنئے ۔ کہتا ہے ؎

شہنشاہِ شریعت بود منشورش کتاب قرآن — ایں زماں قائم مقام او امام اکرمست

ظلّ اللہ شاہ ابن احمد ابوالعباس امیرالمومنین — آنکہ آل دودۂ عباس را سردفتر است خلیفہ عباسی ست

آفتابِ شرع و ملت آسمانِ ملک و دین — آنکہ بر تختِ خلافت را جمالش زیور است

تقریباً ساڑھے تین صدی بعد آخری عباسی خلیفہ مصر نے ۹۲۳ھ میں ترکی آل عثمان کے سلطان سلیم کو یہ منصب جلیلہ سپرد کر دیا تھا ۱۳۳۶ھ مطابق ۱۹۱۸ء تک ترکی سلاطین بحیثیت امیرالمومنین عیسائی حکومتوں کی نظروں میں خار کی طرح کھٹکتے تھے ۔ شریف حسین کو آلہ کار بنا کر دشمنِ اسلام قوتوں نے ترکی خلافت کا خاتمہ کرا دیا تھا مسلمانانِ ہند میں جو ہیجان و شور و شغب سالہا سال تک ہوتا رہا وہ اسی شیفتگی کی بنا پر تھا جو مسلمانانِ عالم کی اس مرکزی قوت سے تھی اب سوچنا چاہیئے کہ ملت اسلامیہ کی یہ عقیدت اور شیفتگی خاص کر اموی عباسی خلافتوں سے کیوں رہی اور بقول سبائیت زدہ اہل قلم جن "آل رسول" کے خون کا بدلہ لینے کے لئے عباسی خلافت کفار تتار کے ہاتھوں ختم کرا دی گئی اور جن "آل رسول" کی خلافت قائم کرنے کے لئے ابن علقمی و نصیر طوسی جیسے روافض نے ہلاکو کے ٹڈی دل کو خفیہ سازشوں سے بلایا تھا ان کی خلافت کیوں نہ قائم ہو سکی ۔ نیز شریف حسین نے "آل رسول" کی خلافت قایم کرنے کے لئے جو کچھ کیا اس کا نتیجہ وہ کیوں مرتب ہوا جو دنیا دیکھ رہی ہے ۔ ان امور پر اگر غور کر لیا جائے اور جاہلی تعصب کی عینک کچھ دیر کے لئے آدمی اتار دے اس پر کھل جائے گا کہ اُمت مسلمہ میں کامیابی اسے ملتی ہے جو قواعد دینیہ کی پابندی کرے ، آداب سیاست و جہانبانی سے بہرہ ور ہو ۔ رائے عامہ اپنے حق میں استوار کرے اور ملت کے سامنے کوئی واضح تعمیری نصب العین رکھے ۔

یہی سبب ہے جو علوی اشخاص کے خروجوں میں نہ عامۃ المسلمین نے کبھی ساتھ دیا اور نہ علماء و فقہاء نے حکومت قائمہ کے خلاف باغیانہ اقدامات کی کسی نہج تائید کی علویوں کی پیہم شکستوں اور ناکامیوں کو حفظ دین کے لئے ایثار و قربانی کا رنگ دینے کو ملاحظہ ہوں کیسے کیسے مہمل قصے تراشے گئے۔ امیر المؤمنین ہشام جیسے نیک صفت خلیفہ کے خلاف زید بن علی بن الحسین جو باغیانہ اقدام میں مارے گئے تھے ان کی تقدیس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بول کر ایک اکذب الاحادیث وضع کر ڈالی (ترجمہ بحوالہ الاسلام الصحیح صفحہ ۳۵۴ طبع بیروت ۳۵۴ھ)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ زید بن حارثہ کی طرف اٹھی تو فرمایا (میرے اہل بیت میں سے ایک مظلوم کا یہی نام ہوگا۔ اللہ کی راہ میں قتل ہونے والے اور میری امت میں سے سولی پر لٹکائے جانے والے کا یہی نام ہوگا) زید بن حارثہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ”زید تم مجھ سے اور قریب ہو جاؤ۔ اللہ تمہاری محبت میرے دل میں اور زیادہ کرے کیونکہ تمہارا نام میری اولاد میں سے ایک پیارے بیٹے زید کا ہے۔“

یہ زید جنہیں کذاب راوی نے آنحضور رسالتمآب سے منسوب الفاظ میں میری اولاد میں سے ایک پیارے بیٹے“ کہلوایا ہے حضرت حسین کے پوتے تھے جو آنحضرت صلعم کے وقت رحلت قربانی سے نصف صدی سے زیادہ عرصہ بعد تولد ہوئے۔ اور آپ کی وفات سے ایک سو بارہ

برس بعد حکومت قائمہ کے خلاف بغاوت میں مارے گئے۔ ان صاحب کو جو احکام شریعت کی خلاف ورزی میں جماعت سے علیحدہ ہو کر بغاوت) میں مقتول ہوئے "زید شہید" کہا گیا۔ پھر ان زید سے کوئی بیس یا بیس سال بعد حکومت قائمہ کے خلاف دوسرے علوی فرد محمد نام الارقط لقب نے ۱۴۵ھ میں علم بغاوت بلند کیا۔ باغیانہ اقدام کی کامیابی کے واسطے ضعیف الاعتقاد عوام کو بہکانے کے لئے اپنے کو "مہدی" کہا اور کہلوایا ان کے بھی اسی طرح مقتول ہوتے پر سبائی راوی نے دیو مالائی قماش کی یہ جھوٹی کہانی گھڑ ڈالی کہ محمد الارقط کے بغاوت میں مارے جانے سے ایک سو پینتیس برس پہلے ہی آنحضرت صلعم نے ان کے مقتل گاہ پر مع جماعت صحابہ نماز جنازہ پڑھ کر فرمایا تھا کہ یہاں میری اولاد سے ایک "نفس زکیہ" مقتول ہوگا۔ اموی اور عباسی خلفاء کے مفروضہ مظالم میں "نفس الزکیہ" کا پروپیگنڈا اس شدت سے کیا گیا کہ نام کے بجائے یہی سبائی لقب اب بھی مودودی صاحب جیسے "مفکر اسلام" کی زبان قلم سے بار بار ادا ہوتا ہے۔ خیر القرون کے مسلمان "ابناء رسول" کی حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے اور خوب جانتے تھے کہ آنحضورؐ کے صلب مطہر سے چار صاحبزادے ہوئے جو سب بچپن میں فوت ہو گئے۔ آپ کے کسی فرزند کا سن بلوغت بیانا منشائے الٰہی میں نہ تھا۔ فرمادیا گیا وَمَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ (اور محمد تم میں سے کسی ایک مرد کے بھی باپ نہیں ہیں لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں اور خاتم النبیین) چاروں فرزندان رسول اللہؐ قاسم، وطاہر و عبداللہ وابراہیم علیہم السلام کا بچپن ہی میں وفات پا جانا بیّن ثبوت ہے کہ اس دنیا میں نہ کوئی فرزند رسول اللہ ہے اور نہ "ابناء رسول کی کوئی ذریت

خلافت کا راز بھی اسی میں پنہاں سمجھے کہ وہم وراثت نہ پیدا کہیں ہو

جو زندہ رہا ہوتا بیٹا نبی ؐ کا عجب کیا وہ کرتا وراثت کا دعویٰ
نہ اٹھتا وہ خود تو کوئی اور اٹھاتا نواسوں کی تاریخ کو دیکھے دنیا

نواسوں کی تاریخ مظہر ہے اسکی
کہ بیٹے نبی کے رہے کیوں نہ باقی

شاہ ولی اللہؒ محدث دہلوی نے اولاد علیؓ کے ادعائے خلافت کے سلسلہ میں اپنے مخصوص طرز سے اظہار حقیقت ان الفاظ میں کر دیا ہے (ازالۃ الخفاء ج ا ص ۲۸۴)

" در عنایت ازلی مقرر بود کہ ہیچگاہ حضرت مرتضیٰ و اولاد او تا داماں قیامت منصور نہ شوند و ہیچ گاہ خلافت ایشاں علیٰ وجہہا صورت نہ گیرد بلکہ از میانِ ایشاں ہر کہ دعوت بخود کند و بقتال بر آید مخذول بلکہ مقتول گردد و خدای تعالیٰ مے فرماید وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ۔ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُوْنَ

(وللخلفاء الذین ھم خلفاء الانبیاء حقا اسوۃ المرسلین فھم المنصورون وھم الغالبون۔)

ختم شد

سیرۃ امام اعظم ابوحنیفہؒ

اتہام شیعیت کی حقیقت

مرتبہ

پروفیسر حکیم سید علی احمد عباسی ایم، ایس، سی علیگ

فاضل اسلامیات

محمود ۱/۲۶ بی ایریا، لیاقت آباد کراچی ۱۹